MIRRAT UL ARIFEEN INTERNATIONAL
ماھنامہ
مرآۃ العارفین انٹرنیشنل
لاہور
جلد نمبر 25
شمارہ نمبر 08
دسمبر 2024ء/ جمادی الثانی 1446ھ
WWW.MIRRAT.COM

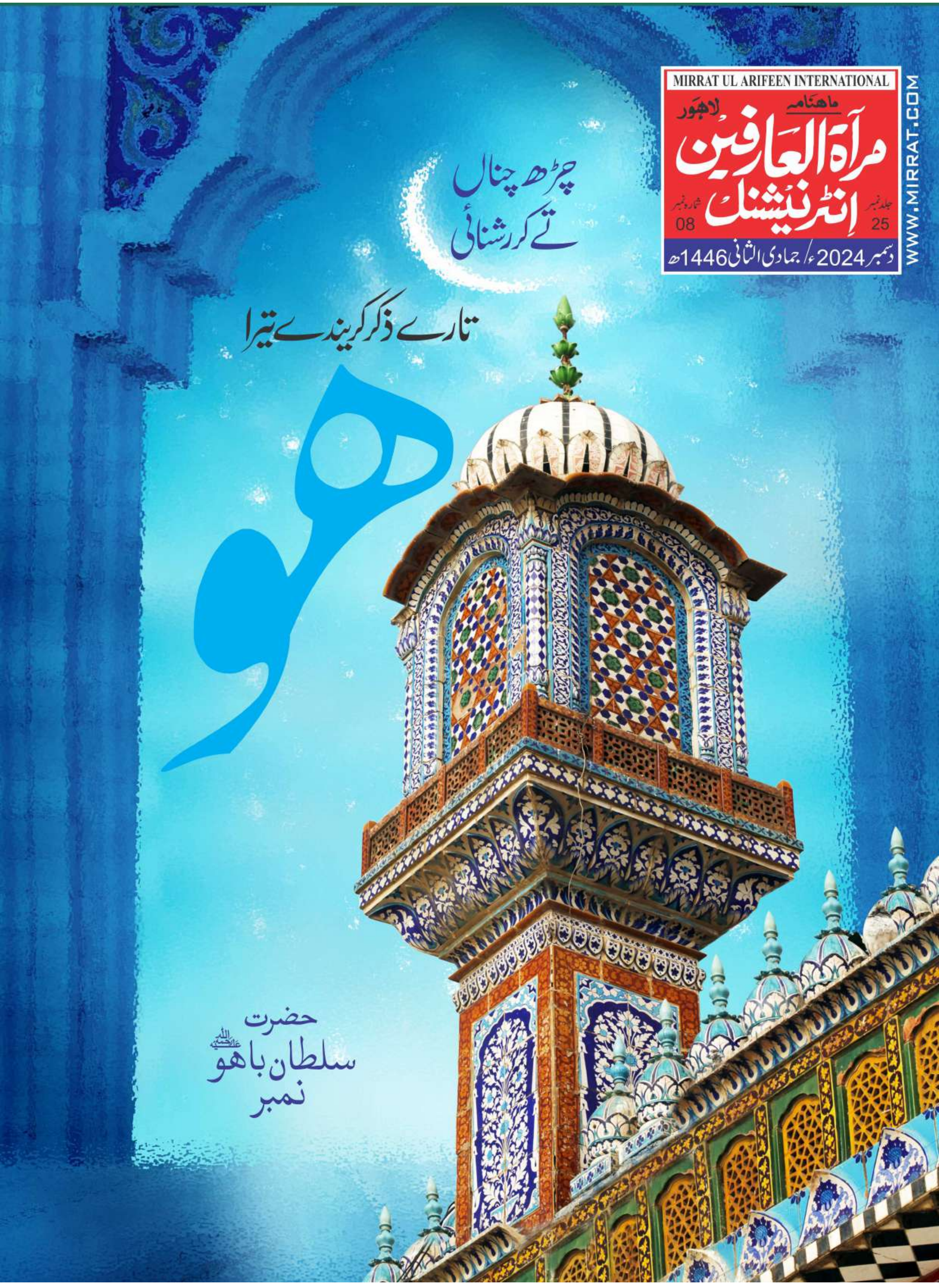

درخت زندگی کے ضامن ہیں

یہ نہ صرف زمین کو سرسبز و شاداب بناتے ہیں بلکہ ہمیں آکسیجن، سایہ اور پھل فراہم کرتے ہیں۔
درخت ماحول کو صاف، فضائی آلودگی کو کم اور زمین کے درجہ حرارت کو متوازن رکھتے ہیں۔

درختوں کی بے دریغ کٹائی
خطرناک عمل ہے

کیونکہ یہ سیلاب، زمین کے کٹاؤ اور
ماحولیاتی تبدیلیوں کا باعث بنتی ہے۔

اس لئے درختوں کو بچائیں

تاکہ زمین کی خوبصورتی اور نسلِ انسانی کی بقا یقینی بنائی جا سکے۔

بطور ایک ذمہ دار شہری آپ اپنی حیثیت میں
اگر صرف ایک درخت بھی لگا سکتے ہیں تو
وہ درخت آج آپ کو لگا دینا چاہیے۔

مسلسل اشاعت کا پچیسواں سال

MIRRAT UL ARIFEEN INTERNATIONAL

ماہنامہ مرآۃ العارفین انٹرنیشنل لاہور

دسمبر 2024ء/ جمادی الثانی 1446ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فیضانِ نظر

سُلطان الفقر حضرت سخی سُلطان مُحمّد اصغر علی صاحب قدس سرہ العزیز

چیف ایڈیٹر: صاحبزادہ سلطان احمد علی

ایڈیٹوریل بورڈ:
- سید عزیز اللہ شاہ ایڈووکیٹ
- مفتی محمد شیر القادری
- افضل عباس خان

آرٹ ایڈیٹر:
- محمد احمد رضا
- واصف علی

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری رضی اللہ تعالیٰ عنہ (اقبال)

سلطان العارفین حضرت سلطان باھُو کی نسبت سے شائع ہونے والا فلسفۂ وحدانیت کا ترجمان،
اصلاحِ انسانیت کا پیمبر، اتحادِ ملّتِ بیضا کے لئے کوشاں، نظریۂ پاکستان کی روشنی میں استحکامِ پاکستان کا داعی

اس شمارے میں

1	اقتباس		3
	اداریہ		
2	دستک		4
	حضرت سلطان باھو (علیہ الرحمۃ) نمبر		
3	Reclaiming Unity: A Dialogue Between Science and Sufism	Dr. Aalia Sohail	5
4	تصوف پہ ایک مکالمہ	صاحبزادہ سلطان احمد علی	8
5	مولانا رومؒ اور حضرت سلطان باھُوؒ کا تصورِ زمان و مکاں	ڈاکٹر ادریس آزاد	12
6	حضرت سلطان باھُوؒ کا نظریۂ تحرّک و عملیت پسندی	وسیم فارابی	16
7	جنہاں عشق نہ خرید کیتا باھو	ڈاکٹر رشد اللہ شاہ	23
8	مولانا جلال الدین رومی اور حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہما) انسانیت کیلئے امن اور محبت کی معتبر نوید	ڈاکٹر نجیب حیدر ملغانی	28
9	ابیاتِ باھو (رحمۃ اللہ علیہ): ایک توضیحی مطالعہ	ڈاکٹر طالب حسین سیال	31
10	اخلاقی رویّے اور صوفی ازم	نعیم فاطمہ علوی	33
11	ہووِن سونا سڈاون سکا	ڈاکٹر ساجد محمود	36
12	نسلِ نو کی کردار سازی: تعلیماتِ مولانا روم اور حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہما) کے تناظر میں	مفتی محمد شیر القادری	39
13	اصلاحِ نفس کے اصول: افکارِ حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) سے نوجوانوں کی روحانی تربیت	لئیق احمد	43
14	اے فقیر قادری، اے حضرت باھُو سخی (رحمۃ اللہ علیہ)	مستحسن رضا جامی	48
15	Abyat e Bahoo	Translated by: M.A Khan	49

فی شمارہ آرٹ پیپر	فی شمارہ نیوز پیپر
110 روپے	80 روپے
سالانہ (ممبرشپ) 1320 روپے	سالانہ (ممبرشپ) 960 روپے

یورپین پونڈ	امریکی ڈالر	سعودی ریال
280	400	800

اپنی بہترین اور موثر کاروباری تشہیر کیلئے مرآۃ العارفین میں اشتہار دیجئے رابطہ کیلئے: 0300-1275009

پبلشر سجاد علی چوہدری نے قاسم نعیم آرٹ پریس، بندروڈ، لاہور سے چھپوا کر 698-BS-8 تاج کمپنی چوک نزد ایم سی بی چوہان روڈ بندروڈ لاہور سے شائع کیا

برائے خط و کتابت: ماہنامہ مرآۃ العارفین انٹرنیشنل P.O.Box No.11 جی پی او، لاہور E-mail: miratularifeen@hotmail.com
WWW.ALFAQR.NET, WWW.MIRRAT.COM

الله

"وَ لَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ"

"اور بے شک ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا کہ اس زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے"۔

(الانبیاء:105)

"حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) سے مروی ہے کہ:

"بے شک بعض لوگ اللہ تعالیٰ کے ذکر کی چابیاں ہوتے ہیں، انہیں دیکھ کر اللہ تعالیٰ یاد آجاتا ہے"۔

(شعب الایمان، بَابُ محبۃ اللّٰہ عزوجل)

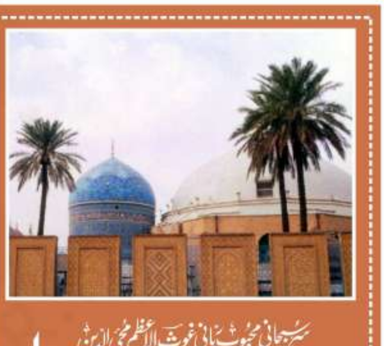

سرچشمۂ جہانی محبوبِ سبحانی غوث الاعظم محی الدین

سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی (رضی اللہ عنہ)

فرمان

"حرف "و" سے ولایت ہے جس کا انحصار تصفیّہ پر ہے جیسا کہ اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا: "خبردار! بیشک اولیاء اللہ پر خوف ہے نہ غم، ان کے لئے خوشخبری ہے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت کی زندگی میں بھی"۔ ولایت کا نتیجہ یہ کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے اخلاق سے متخلق ہو جائے جیسا کہ حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "اخلاق الٰہیہ سے متخلق ہو جاؤ"۔ چنانچہ صفاتِ بشری کا لباس اُتار کر صفاتِ الٰہیہ کا لباس پہننا ہے جیسا کہ حدیث قدسی میں فرمان حق تعالیٰ ہے: "جب میں کسی بندے کو اپنا محبوب بنالیتا ہوں تو اُس کے کان، اُس کی آنکھیں، اُس کی زبان، اُس کے ہاتھ اور اُس کے پاؤں مَیں بن جاتا ہوں، پھر وہ مجھ ہی سے سنتا ہے، مجھ ہی سے دیکھتا ہے، مجھ ہی سے بولتا ہے، مجھے ہی سے پکڑتا ہے اور مجھ ہی سے چلتا ہے"۔ پس خود کو ماسوی اللہ کی آلائشوں سے پاک صاف رکھو جیسا کہ فرمانِ حق تعالیٰ ہے: "آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرمادیں کہ حق آگیا ہے اور باطل مٹ گیا ہے کہ باطل مٹنے ہی کی چیز ہے"۔ یہاں پر پہنچ کر مقام "و" حاصل ہو جاتا ہے۔

(سر الاسرار)

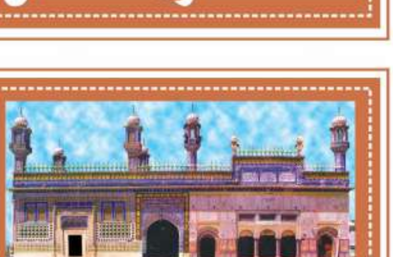

سُلطانُ العَارفین

حضرت سُلطان بَاھُو (رحمۃ اللہ علیہ)

فرمان

میں شہباز کراں پروازاں ہُو وِچ دریا کرم دے ھُو
زبان تاں میری کُن برابر موڑاں ہُو کم قلم دے ھُو
افلاطون ارسطو جیہیں میرے اگے کس کم دے ھُو
حاتم جیہیں لکھ کروڑاں ہُو در باھُو دے منگدے ھُو

(ابیاتِ باھُو)

فرمانِ قائداعظم محمد علی جناح (رحمۃ اللہ علیہ)

ایمان، اتحاد، تنظیم

"مسلمان فاتح، تاجر، مبلغ اور اُستاد کی حیثیت سے ہند میں وارد ہوئے اور اپنی تہذیب ہمراہ لائے۔ یہاں زبردست سلطنتیں قائم کیں اور عظیم تہذیبیں تعمیر کیں۔ انہوں نے برصغیر کی اصلاح کی اور اسے نئے سانچے میں ڈھالا"۔

(عید الفطر اتحاد اور اخوت کی علامت ہے، 11 اکتوبر، 1942ء)

فرمانِ علامہ محمد اقبال (رحمۃ اللہ علیہ)

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کار کشا، کار ساز
خاکی و نُوری نہاد، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اُس کا دلِ بے نیاز

(بالِ جبریل)

عصرِ حاضر، ذہنی امراض اور تعلیماتِ صوفیاء کی معاشرتی ضرورت

دنیا میں ذہنی دباؤ (Depression) تیزی سے پھیلتی ہوئی ایک عام مگر سنگین طبی بیماری ہے- ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن (WHO) کی سالانہ رپورٹ کے مطابق ذہنی دباؤ کی بیماری دنیا بھر میں تقریباً 280 ملین افراد کو متاثر کرتی ہے جو تقریباً دنیا کی 3.8 فیصد آبادی بنتی ہے- اسی طرح سالانہ 7 لاکھ سے زیادہ افراد ذہنی دباؤ کی وجہ سے زندگی کی بازی ہار جاتے ہیں جبکہ کئی لوگ بالخصوص نوجوان لڑکے لڑکیاں خودکشی پر مجبور ہو جاتے ہیں- عالمی ادارہ صحت کے مطابق اس کرۂ ارض میں ہر 40 سیکنڈ میں ایک آدمی کی موت خودکشی سے ہوتی ہے- رپورٹ کے مطابق 15 سے 29 برس کے لوگوں میں موت کی تیسری بڑی وجہ خودکشی ہے- علاوہ ازیں رپورٹ کے مطابق دنیا میں ہر 100 اموات میں سے ایک موت خودکشی کا نتیجہ ہے- 2008ء میں ذہنی دباؤ کو تیسری بڑی بیماری قرار دیا گیا تھا اور اس کی بڑھتی ہوئی شرح سے یہ اندازہ لگایا کہ 2030ء تک یہ دنیا کی پہلی بڑی بیماری بن جائے گی-

ریکارڈ ڈیٹا کے مطابق ہر برس 7 لاکھ 20 ہزار لوگ اپنی زندگی کو اپنے ہاتھوں ختم کر لیتے ہیں جبکہ خودکشی کی کوشش کرنے والوں کی تعداد تو خودکشی سے مرنے والوں سے بھی کہیں زیادہ ہے- اسی طرح پاکستانی نوجوانوں میں بھی خُودکشی اور ذہنی امراض کا تناسب انتہائی تشویش ناک حد تک بڑھ رہا ہے- خودکشی کی وجوہات میں غربت، بے روزگاری، رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ، مایوسی یا دیگر سنگین ذہنی امراض شامل ہیں- پاکستان کا شمار بھی ان ممالک میں ہوتا ہے جہاں بڑی تعداد میں لوگ ذہنی دباؤ کا شکار ہیں- ماہرین کا کہنا ہے کہ ملک بھر میں تقریباً 25 فیصد افراد ذہنی دباؤ یا کسی اور نفسیاتی بیماری سے دوچار ہیں-

ذہنی دباؤ یا اس طرح کی دیگر پیچیدہ بیماریوں کی وجوہات کو دیکھا جائے تو یہ نفسیاتی، سماجی، اقتصادی، ماحولیاتی اور مختلف حالات سے متاثرہ لوگوں میں زیادہ ملتی ہیں- بسا اوقات یہ بیماریاں وسوسوں، گوناگوں اندیشوں، خوف، ناامیدی سے واقع ہوتی ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامیدی اور انسان کے اندرونی و روحانی تعلق باللہ کے کمزور ہونے کے نتیجے میں انسان کے گھیر لیتی ہیں- سرمایہ دارانہ سوچ اور خالص مادی فکر اس کی ایک بنیادی وجہ ہے-

قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان کو نہ کچھ خوف ہو گا اور نہ وہ غمناک ہوں گے“- (البقرہ:38)

تصوف اور روحانیت کی تعلیمات کا نچوڑ دیکھا جائے تو وہ اللہ تعالیٰ پر بندے کا یقینِ کامل، ایمان باللہ، توکل باللہ اور خود اعتمادی کی طرف بلاتا ہے، جس سے انسان کا ذہن، قلب اور روح مطمئن ہوتے ہیں- یوں انسان اللہ کی رضا پر راضی رہتا ہے اور مایوسی کا شکار نہیں ہوتا-

سلطان العارفین حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) اپنے بیت میں فرماتے ہیں: ”قادر دے ہَتھ ڈور اساڈی باھوؒ جیوں رکھے تیوں رہیے ھو“

سورۃ یونس میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”جان لو! کہ جو اللہ کے دوست ہیں ان کو نہ کچھ خوف ہے اور نہ کوئی غم ہے“- (یونس:62)

تصوف کی تعلیمات اطمینان قلب کی طرف راغب کرتی ہیں جو کہ ذکر اللہ سے حاصل ہوتا ہے- آخر کیا وجہ ہے کہ اللہ پاک نے اطمینان قلبی کے لئے اپنا ذکر مخصوص کیا- جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے:

”اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ“ ”جان لو کہ اللہ تعالیٰ ہی کے ذکر سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے“- (الرعد:28)

صوفیاء کرام کی تعلیمات پر عمل کرنے والے افراد اور معاشروں میں، تصوف اور روحانیت سے دور معاشروں کے مقابلے میں ذہنی دباؤ اور خودکشی کے واقعات بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں- حتیٰ کہ مغربی اور خود کو غیر مذہبی کہلوانے والے معاشرے بھی میڈیٹیشن (meditation) کے نام پر روحانی علاج کو دھڑا دھڑ اپنا رہے ہیں- چنانچہ ضروری ہے کہ معاشروں کا تقابلی جائزہ لیا جائے کیونکہ صبر، شکر، قناعت، عاجزی، توکل اور رضائے الٰہی اُن معاشروں کا لازمی جزو ہیں جہاں تصوف زندگی میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے نتیجے میں نفسیاتی امراض اور مایوسی پنپنے نہیں پاتے- چنانچہ نوجوان نسل کو روحانی بیداری اور صوفی تعلیمات پر عمل کرنے کی جانب مائل کرنا چاہئے کیونکہ اسی میں ہماری بقاء ہے-

Reclaiming Unity:

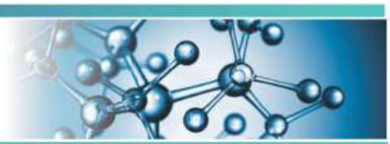

A Dialogue Between Science and Sufism

Dr. Aalia Sohail

1 .The Epistemological Divide: Intellectus and the Rise of Scientism

The key constraint on modern scientific methodology lies in its disassociation from Intellectus—an ancient term representing a form of intuitive and spiritual knowledge. In medieval philosophy, Intellectus was not merely a rational faculty, but something akin to Qalb-e-Salim (the pure heart), Shah e Aqal (the king of reason) a source of insight beyond logic and reason. The Enlightenment-era shift toward empirical and rational thought marked the emergence of scientism, a worldview grounded in the exclusive reliance on rationalism, positivism, empiricism, and objectivism. This narrow focus, while productive in many ways, excluded alternative forms of knowing, such as intuition and revelation—areas profoundly explored by Sufism.

The distinction between "scientific" and "scientism" must be recognized. While "scientific" inquiry promotes objective, empirical knowledge in a positive sense, "scientism" carries a negative connotation, implying a reductive reliance on these methods to the exclusion of other valuable forms of understanding.

2 .The Impact of the Enlightenment on Language and Science

In the 17th century, when the Royal Society was established in England to promote research in science, it was decreed that scientists should avoid ambiguous or symbolic language in favor of precision and accuracy. This decision, while advancing clarity, also stifled the symbolic richness that had historically enriched European languages. 20th century Austrian philosopher Ludwig Wittgenstein's famous assertion, "My world ends where my language ends," illustrates the profound limitation introduced by this shift. By narrowing language to purely denotative meanings, much of the resonance and depth, particularly seen in Sufi literature, was lost.

This move toward monolingualism—restricting words to literal meanings—impoverished the expression of abstract and metaphysical ideas. The symbolic and metaphorical language used by Sufi mystics to explore the divine and the infinite was sidelined, creating a significant gap between scientific discourse and other, more holistic forms of knowledge.

3. Sufi Literature as a Bridge: The Power of Symbolic and Metaphoric Language

Sufi literature has the potential to enrich scientific understanding by reintroducing language that operates on multiple levels of meaning. It can bridge gaps in modern discourse by offering metaphors and symbols that convey complex spiritual realities. Some languages, such as Finnish, lack gendered pronouns for humans or God, demonstrating how linguistic structures shape our understanding of the world. Language is not a static artifact but a living, evolving entity that grows alongside human consciousness, reflecting the expansion of the mind, soul, and imagination.

Sufi metaphors serve as invaluable cognitive tools. Cognitive linguists like Lakoff and Johnson argue that human thought is inherently metaphorical, and metaphors provide a framework for understanding abstract concepts like the infinite essence of God or the spiritual journey. They are not only aids for comprehension but also for problem-solving, suggesting that a synthesis between Sufi thought and scientific reasoning could help resolve some of the philosophical tensions that exist today.

4. Sufism and Science: Paths Toward Unity

Contrary to the view that science and mysticism are inherently at odds, a harmonious relationship between the two can be fostered. Sufi philosophy aligns with the idea of Tawhid—the unity of all existence. Just as Sufism emphasizes the interconnectedness of all things, science too, when stripped of scientism's rigid boundaries, reveals the underlying unity of nature. The different spheres of art, morals, literature, and science, which were fragmented during the Enlightenment, can be brought back together under a more holistic understanding of the world. Emphasizing the shared human experience—whether in the East or the West—underscores the commonality of all life. Sufi thinkers, such as Rumi, invite everyone to join the "caravan of love," highlighting the universal nature of spiritual experience. No matter one's religion or culture, we all share the same human quest for meaning and connection.

5. Sufism's Emphasis on Love Over Fear

A common misconception is that the concept of God in Islam is distant, fearsome, and authoritarian, creating a relationship of servitude where humans grovel before a terrifying deity. This is in stark contrast to the teachings of Sufism, which promote a God of love, compassion, and intimacy. Sufis emphasize that the relationship with God is one of love, not fear. The use of the metaphor of the lover and the beloved in Sufi poetry reflects this dynamic: God is not a distant judge, but the Beloved, deeply intertwined with the seeker's soul.

Sufis have always advocated for the religion of love. Their teachings prioritize conquering base emotions—anger, selfishness, materialism—without depriving individuals of life's simple pleasures. This is why, in Sufi literature, we find Manajat—intimate supplications in which the seeker expresses love for God, rather than requesting rewards in paradise.

6.The Role of Sufis in Fostering Inclusivity and Tolerance

Sufism offers profound lessons in inclusivity, love, and tolerance. An example is the tradition of serving daal (pulses) at langars (communal meals) in Sufi shrines, which is permissible across various religions. This act symbolizes the shared humanity that Sufism emphasizes. In a world often divided by race, religion, and ideology, Sufism's teachings remind us of the beauty of shared experiences and common values.

The Sufi approach challenges stereotypes, such as the view that Western people are arrogant or that individuals in the Islamic world are slavish conformists. These misconceptions can be dispelled by recognizing the Sufi message of love, tolerance, and humility.

7.The Intimate Divine Connection: Manajat and Divine Love

One of the most unique aspects of Sufi practice is the Manajat, a form of prayer that has no direct equivalent in other religious traditions. In these supplications, the seeker expresses a deeply personal and intimate relationship with God. A Sufi does not ask for material rewards or even for entry into paradise; rather, they seek love and the continued presence of the Divine. Even in hell, a Sufi would prefer to experience the love and vision of God than be without it.

Sufism portrays a God who cares deeply for creation, never abandoning His creatures. This contrasts with the Deistic image of God as a distant clockmaker, detached from the world. Instead, the Sufi God is actively involved in the lives of individuals, always ready to rescue them, even at the final moments of their lives.

8.Conclusion: The Role of Love in Rescuing Humanity

Sufism teaches that within every human being is a spark of the Divine, breathed into us by the Holy Spirit. This divine connection offers humanity a way to transcend base behaviors and reorient towards love and compassion. In a world marked by fragmentation—whether between science and spirituality, or among cultures—Sufism offers a path toward unity.

By reintegrating love, intuition, and a sense of the divine into our understanding of the world, we can restore balance. The fusion of Sufi wisdom with scientific inquiry holds the potential to lead us toward a more harmonious, compassionate, and enlightened existence.

☆☆☆

تصوف پہ ایک مکالمہ

مہمان: صاحبزادہ سُلطان احمد علی | میزبان: لئیق احمد

مسلم انسٹیٹیوٹ، ادارہ فروغ قومی زبان اور یونس ایمرے انسٹیٹیوٹ کے انعقاد سے اسلام آباد میں ”مولانا رومی و سلطان باھو: انسان دوستی، امن و محبت اور رواداری کے پیامبر“ کے عنوان سے ایک قومی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا- کانفرنس کے دوسرے روز تصوف پہ ایک مکالمہ (dialogue) منعقد کیا گیا جس میں تصوف سے متعلق اہم سوالات اور عمومی مباحث پہ سیر حاصل گفتگو کی گئی- دوروزہ کانفرنس میں مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے معززین، اسکالرز اور دانشوروں کا خیر مقدم کیا گیا، جو ان صوفی بزرگوں کی فکری تعلیمات پر تبادلہ خیال کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے-

اس سیشن میں صاحبزادہ سلطان احمد علی نے بطور مہمان شرکت کی اور لئیق احمد لیکچرر شعبہ اسلامی علوم، یونیورسٹی آف کراچی اس سیشن کے مہمان / اینکر تھے-

سوال: تصوف میں ملا اور صوفی کی ایک ڈیبیٹ ہے، اور اس میں علم کے حوالے سے بات بہت ہوتی ہے کہ صوفیاء علم کی نفی کرتے ہیں- زیادہ تر جب ہم ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) کے بھی کئی ابیات ہیں تو اس میں ایسا تاثر محسوس ہوتا ہے جیسے وہ نفیٔ علم کر رہے ہیں؟

جواب: بنیادی طور پہ سمجھنا چاہیے کہ علم کیا ہے؟ صوفیاء کے نزدیک، علم کا نظریہ کیا ہے؟ صوفیاء کرام کا علم کا جو تصور ہے اس سے مُراد، وہ کہتے ہیں کہ اُس علم سے مطابقت رکھنا ہے جو علمِ عرفان (divine knowledge) ہے اور ان کے نزدیک علم کا مقصود معلوم تک پہنچنا ہے- جیسے حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) کا ایک معروف قول ہے کہ ”علم وہ ہے جو عالم کو معلوم تک پہنچا سکے“ یعنی علم وہ چیز ہے جو حاصل کی جا رہی ہے، عالم وہ ہے جو حاصل کر رہا ہے اور معلوم وہ ہے جو حاصل کا نتیجہ ہے- حاصل کا نتیجہ حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کا قرب، اس کی معرفت ہے- ان کے نزدیک ایسا علم جو عالم کو معلوم تک پہنچا سکے وہ حاصل کرنا چاہیے اور یہی اس علم کی افادیت ہے، لیکن ایسا علم جو اللہ تعالیٰ کے قریب کرنے کی بجائے بندے کو اللہ تعالیٰ سے دور کر دے، اس کو حجاب میں مبتلا کر دے، اس علم سے وہ اپنے مقاصدِ زندگی کے تناظر میں اختلاف کرتے ہیں کیونکہ اگر ایک آدمی کی زندگی کا مقصد ہی یہ ہے کہ میرے پاس بہت ساری دولت اکٹھی ہو جائے تو وہ شاید کسی دوسرے زاویے سے سوچے گا اور اگر آپ اس کو یہ بتائیں کہ مَیں علم اس لیے حاصل کر رہا ہوں کہ مَیں اللہ تعالیٰ تک پہنچ سکوں تو وہ کہے گا کہ آپ بڑے بیوقوف ہیں، وہ غیب ہے، وہ تو موجود نہیں ہے اس تک تم کیسے پہنچ سکتے ہو- اس کے نزدیک یہ مادہ پرست دنیا ہے سارا کچھ مادے کے اوپر بنا ہے- مادیت پرستی کے علاوہ آپ جو بھی محسوس کر سکتے ہیں وہ اس کا انکار کرے گا- زندگی کے بارے میں ناقدانہ سوچ (criticle thinking) سے اس نے اپنا جو ماڈل سیٹ کیا ہوا ہے اس کے اوپر آپ کو دیکھے گا کیونکہ وہ اس کے اندر اتنی گہرائی کے ساتھ داخل ہو چکا ہے کہ اس کا جینا مرنا سارا کچھ دولت کا حصول ہے جو اس نے اپنے ذہن میں بنا رکھا ہے- جبکہ صوفیاء کے نزدیک زندگی بھر کا حاصل وصالِ ذاتِ حق ہے اور ان کے نزدیک وہ شخص اتنا زیادہ کامیاب ہے وہ جو اللہ تعالیٰ کے جتنا قریب ہے اور وہ اتنا ناکام ہے جو اس سے جتنا زیادہ دور ہے- صوفیا کے نزدیک دو روایات علم کے بارے میں کہی جاتی ہیں- حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) نے بھی عین الفقر میں دونوں کو لکھا ہے، ایک ”اَلْعِلْمُ

نُوْرٌ "علم ایک نور ہے اور دوسرا "اَلْعِلْمُ حِجَابُ الْاَکْبَرْ" علم سب سے بڑا حجاب ہے- آپ یہ کیسے فرق کریں گے کہ کون سا علم نور ہے اور کون سا علم حجاب اکبر ہے-

حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) کے نزدیک جو علم آپ کو معلوم کے قریب کر دے یعنی حق اور حقیقت کے قریب کر دے وہ نور ہے اور جو علم حق اور حقیقت سے دور کر دے وہ حجاب اکبر ہے- وہ نور کے حصول کی ترغیب دیتے ہیں اور حجاب اکبر سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں-

سوال: بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں تصوف کے بارے میں اشکالات پیدا ہوتے ہیں، ایک علمی طبقہ ایسا ہے جو دلائل کی بنیاد پر تصوف کو متوازی دین ثابت کرنے کی بات کرتا ہے کہ مکمل دین جو قرآن و سنت سے ہمارے پاس آیا ہے وہ الگ ہے اور تصوف، اس کی تمام تر تعلیمات الگ ہیں- وہ کہتے ہیں کہ صوفیا کا جو عقیدہ توحید ہے وہ قرآن و سنت کے عقیدہ توحید سے مختلف ہے، صوفیاء کا جو عقیدہ رسالت ہے وہ قران و سنت کے عقیدے سے مختلف ہے اسی طرح عقیدہ آخرت بھی مختلف ہے- پھر تنقید کرنے کے بعد بڑے حوصلے سے کہتے ہیں کہ ثابت ہو گیا کہ تصوف ایک متوازی دین ہے- اس کی وضاحت کیسے کی جا سکتی ہے؟

جواب: اس کا تعلق ایک شدت پسندانہ رجحان سے ہے (extreme tendency) کے ساتھ ہے- بہت سے ایسے سکالرز ہیں جن کی علمی حالت بہت متشدد ہوتی ہے- وہ نرم لہجے میں زبان سے سمجھانے کی بجائے اپنی فکر سے جھاڑتے ہیں- دوسرا یہ کہ آپ جیسے صیہونیت سے اختلاف کرتے ہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ یہودیت کے بارے میں کوئی تحقیر آمیز بات کر رہے ہیں اگر آپ ہندوتوا کے بارے میں بات کر رہے ہیں تو اس کا یہ قطعاً مطلب نہیں ہوتا کہ آپ ہندو دھرم کے بارے میں کوئی غلط بات کر رہے ہیں- اسی طرح جیسے انتہا پسند سیاسی عزائم کے باعث صیہونیت ایک خطرناک فلاسفی ہے- اسی طرح ہندوتوا بھی ایک بہت خطرناک نظریہ ہے- اسی طرح جو خارجی تکفیری نظریہ ہے یہ بھی صیہونی اور ہندتوا سے کم نہیں ہے- تصوف کے بارے میں اتنی متشدد رائے بنانا بھی ایک انتہا پسندی ہے- یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سب سے پہلے کلمہ پڑھنے والوں کو اسلام سے خارج قرار دینے کی رسم سیدنا حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کے زمانے میں خوارج نے ڈالی تھی اور جس شخص نے حضرت علی المرتضیٰ (رضی اللہ عنہ) کو شہید کیا تھا اس کا نقطہ نظر بھی یہی تھا-

دوسری بات یہ ہے کہ یہ معاملہ صرف تصوف کا نہیں ہے کہ اس کے بارے میں کہا جائے کہ یہ متوازی دین ہے بلکہ اس طرح کی انتہا پسندی آپ کو دین کے ہر شعبے کے بارے میں نظر آئے گی- مثلاً فقہ کے بارے میں ایک طبقے کی رائے ہے کہ فقہ متوازی دین ہے یعنی جو پورا اجتہاد کا عمل ہوا اس کو چیلنج کیا گیا اور یہ کہہ کے چیلنج کیا گیا کہ یہ تو متوازی دین ہے- یعنی دین کے برابر کوئی ایک نئی چیز لا کر کھڑی کر دی ہے، اس لئے جو قران کہتا ہے، جو سُنت کہتی ہے ہمارے لیے تو وہی سب کچھ کافی ہے- دوسری بات تھیولوجی میں خاص کر مسلم تھیولوجیکل پیراڈائم میں حدیث کے بارے میں ہمارے ہاں ہندوستان کے اندر بیسویں صدی میں کتنی بڑی ڈیبیٹ ہوئی- ابھی بھی بہت لوگ اس کے

اوپر یقین رکھتے ہیں کہ حدیث کو قرآن کے متوازی کے طور پر کھڑا کیا گیا ہے اور وہ ان دلائل سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ حدیث کی کوئی حقیقت نہیں ہے- جب ایک آدمی انتہا پسندی پہ جاتا ہے اور خود کو متوازن نہیں کر پاتا تو کہتا ہے کہ فقہ دین کے متوازی یا دین سے باہر ہے، حدیث دین کے متوازی ہے، حدیث دین نہیں ہے، تصوف متوازی دین ہے، دین کے برابر کوئی چیز ہے- اب آپ ان تینوں نقطۂ نظر رکھنے والوں کو سامنے رکھتے ہوئے، دین سے فقہ، حدیث اور تصوف کو نکال دیں کیونکہ یہ متوازی دین ہیں، اور جائزہ لیں کہ اس کے بعد آپ کے پاس رہ کیا جاتا ہے؟ کیا حدیث کے بغیر قرآن کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ممکن ہے؟ کیا تصوف یعنی تزکیہ، اخلاق و اخلاص کے بغیر قرآن کی روح کو پایا جا سکتا ہے؟ تو گویا حدیث، تصوف اور فقہ

قرآن کریم کی توضیحات و تشریحات ہیں-اخلاق آپ فقہ یا حدیث یاتصوف سے سیکھتے ہیں-ان تینوں کو اگر ختم کر دیں تو بعد میں بچتا کیا ہے-تو کیا یہ ایک انتہائی متشدد نقطہ نظر نہیں ہے؟

یہ ایک خلاف معمول انسان کی سوچ ہو سکتی ہے-کوئی بھی (معتدل) میانہ رو آدمی کسی بھی دینی مسئلے کے بارے میں ایسی بات نہیں کر سکتا-اگر آپ ایک کو خارج کریں گے پھر سب کچھ جائے گا اس لیے چیزیں اپنی جگہ پر موجود رہنے دیں-

سوال: نوجوان جب صوفیاء کی تعلیمات پڑھتے ہیں تو متاثر ہوتے ہیں، متاثر ہونے کے بعد کہتے ہیں کہ آج کوئی زندہ صوفی دیکھنا ہے اورجب وہ خانقاہوں پہ جا کر تلاش کرتے ہیں - خانقاہوں پہ جس طرح کے معاملات آج نظر آرہے ہیں وہ دیکھتے ہیں کہ وہاں پر کوئی قرآن و سنت کی بات نہیں ہے-اگر جو لوگ تصوف کی تعلیمات سے متاثر ہو کر اس راہ پر چلنے کے لئے کوئی عملی نمونہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ ملتا نہیں ہے؟اس حوالے سے روشنی ڈالیں؟

جواب: بنیادی طور پر یہ دو الگ سوال ہیں-ایک یہ کہ جعلی لوگ آگئے ہیں اور دوسرا یہ کہ سچا آدمی ملتا نہیں ہے-پاکستان میں جعل سازی کا فروغ صرف خانقاہ تک محدود نہیں بلکہ یہ ہر شعبہ میں موجود ہے-اگر معاشرے کی نفسیات کو دیکھا جائے تو اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ڈی ڈبلیو ایک مشہور جرمن خبر رساں ادارہ کی ویب سائٹ پہ خبر تھی کہ 10 ہزار کے قریب سائنس سے متعلقہ جعلی ریسرچ پیپرز مستند ویب سائٹس سے اور ریسرچ جرنل سے ہٹائے گئے ہیں اور ان میں پاکستان دوسرے نمبر پہ ہے-یہ جعلی ریسرچز اسی معاشرے میں موجود ہیں اور اس کے علاوہ جعلی ڈاکٹرز، جعلی میڈیکل سٹاف، پارلیمانی لوگوں کی جعلی ڈگریاں، ٹیکس بچانے کے لیے جعلی بزنس ادارے بھی اسی معاشرے میں موجود ہیں-اسی طرح اس معاشرے میں ہمیں جعلی ملاں، جعلی شاعر اور جعلی ڈگریاں حاصل کرنے والے لوگ مقدس اداروں میں بیٹھے نظر آتے ہیں-اس معاشرے میں جب ہر چیز جعلیت پہ مبنی ہے، تو پانچ دس بدنصیب جعلی پیر بھی درگاہوں میں گھس گئے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ اس معاشرے کی روش ہے-اس لئے ان جعلی پیروں کے بدلنے کے ساتھ ساتھ پورے معاشرے کی روش کو بدلنا ضروری ہے-

دوسری بات یہ کہ سچے کردار والے عملی لوگ نہیں ملتے-امام ابوالقاسم قشیری اسلامی تصوف کی تاریخ میں سب سے بڑے عملی صوفی تھیورسٹ تھے-اگر آپ تصوف کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ان کی کتاب ”رسالہ قشیریہ“ کو لازمی پڑھیں-امام قشیری نے اپنے مقدمے میں لکھا کہ مجھے تصوف کی کتاب لکھنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کیونکہ تصوف کے نام پہ بہت برائیاں ہو رہی ہیں، جن میں لوگ ہاتھوں میں بڑے مندرے پہن لینے، سبز صافہ اوڑھ لینے، ترکِ شریعت اور جتنی بھی خرافات ہیں، ان کو اپنانے کو تصوف سمجھتے ہیں-یعنی جتنی بھی

خرابیاں امام قشیری نے لکھی ہیں اس رسالے کا مقدمہ پڑھ کر، آپ کو ذرا بھی نہیں لگے گا کہ آپ امام قشیری کے زمانے کے باہر بیٹھے ہیں-آج جتنی خرابیاں تصوف کی ہیں یہ سب خرابیاں امام قشیری نے بیان کی ہیں-

آج امام قشیری کو دنیا سے رخصت ہوئے کم و بیش ایک ہزار برس ہو گئے ہیں ان کی کتاب آج بھی اتنی ہی مطابقت رکھتی ہے-امام قشیری سے متاثر ہونے والوں میں امام الحرمین الجوینی، امام ابو حامد الغزالی، شیخ عبد القادر جیلانیؒ اور امام فخر الدین رازی (رحمۃ اللہ علیہم) جیسے عظیم لوگ تھے-امام قشیری نے تصوف کی ساری علمی روایت کو متاثر کیا اور یہ سب لوگ امام قشیری کے بعد ہوئے ہیں اس کا مطلب یہ ہے جعلی لوگ امام قشیری کے وقت میں بھی تھے اور اتنے ہی زیادہ تھے جتنے آج ہیں-لیکن شیخ عبد القادر الجیلانی، حضرت بہاؤالدین نقشبند، خواجہ معین الدین

چشتی، مولانا رومی اور حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہم) ان کے بعد ہوئے ہیں-

جعلی لوگ ہر دور میں موجود ہوتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سچے لوگ ان میں سے نکل جاتے ہیں بلکہ وہ اپنی جگہ موجود رہتے ہیں- یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حکم فرمایا ہے کہ:

"وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ"[1]

"سچوں کے ساتھ ہو جاؤ"-

امام رازی (رحمۃ اللہ علیہ) نے اپنی تفسیر میں بڑی خوبصورت دلیل دی ہے کہ اگر کسی بھی وقت سچے لوگ روئے زمین سے ختم ہونے ہوتے تو اللہ تعالیٰ اس قدر حکم نہیں فرماتا کہ سچوں کے ساتھ ہو جاؤ- سچوں کے ساتھ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب تک قرآن پڑھنے والے رہیں گے تب تک سچے لوگ روئے زمین پہ موجود رہیں گے- چنانچہ آج اگر قرآن پاک کا حکم ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سچے لوگ بھی موجود ہیں- رہی بات کہ سچے لوگ ملتے نہیں تو یہی تو انسان کا امتحان ہے- بقول حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ):

عِشق سو کھالا جے ہوندا باھوؒ سبھ عاشق ہی بن بہندے ھو

تلاشِ مرشد آسان نہیں ہے، حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) نے ایک، دو یا تین سال نہیں بلکہ اپنی زندگی کے 30 برس ایک سچے مرشد کی تلاش میں گزار دیے- یہ وہ وقت تھا، جب دنیا اسلام کا عروج تھا، ایک طرف عثمانی خلافت تھی، اور نگزیب کا دور دورا تھا، آپؒ کئی درگاہوں پہ گئے، سینکڑوں لوگوں کے پاس گئے مگر کہیں دل مطمئن نہیں ہوا- اس لئے جب بھی کوئی مرشد کی تلاش میں جائے تو اس کو مرشد کے اوصاف پتہ ہونے چاہییں کہ اس کے کامل ہونے کا وصف کیا ہے؟ اگر جذبہ، طلبِ حق ہے تو پھر کامل مرشد کو ڈھونڈیں جیسا کہ حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) نے بھی 30 برس کامل مرشد کی تلاش کی-

حضرت سلطان باھو اور مولانا رومی (رحمۃ اللہ علیہما) کی تعلیمات آج بھی اتنی ہی مطابقت رکھتی ہیں جتنی اپنے زمانے میں رکھتی تھیں- ان تعلیمات کو زندہ رکھنے کیلئے ان پر عمل بہت ضروری ہے- ان کے لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ زندگی گزارنے کا طریقہ کار جو ہم نے قرآن و سنت اور اپنی زندگی کے دیگر تجربات سے سمجھا ہے اس کو ایک عملی طور اپنایا جائے- اگر آپ مولانا رومی اور حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہما) سے پیار کرتے ہیں تو مثنوی شریف کو اور ابیاتِ باھو کو اپنی زندگی میں عملی طور اپنائیں جس کا اثر آپ کے کردار سے جھلکے-

☆☆☆

مولانا رومؒ اور حضرت سلطان باھوؒ کا تصورِ زمان و مکاں

ڈاکٹر ادریس آزاد

علامہ اقبال اپنے خطبات میں لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے زمان و مکاں کا مسئلہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے کیونکہ فلسفہ ہو یا تصوف، ہر دو کا نصب العین ایک ہی ہے کہ وہ لامتناہی تک رسائی (approach) کرنا چاہتے ہیں- یاد رہے کہ اہلِ تصوف کے نزدیک یہ لامتناہی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے- صوفیاء میں اسے مشاہدۂ حق کے نام سے جانا جاتا ہے-

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ’’زمان و مکاں‘‘ فلسفے اور تصوف کا مشترکہ موضوع ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ فلسفے اور تصوف میں فرق بھی، زمان و مکاں کی وجہ سے ہی ہے- دونوں کا حقیقی منہج زمانہ ہی ہے- بالفاظِ دگر دونوں ایک ہی گلی کے مسافر ہیں- یا زیادہ بہتر الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ دونوں زمانے کی گلی میں اس طرح کھڑے ہیں کہ ایک کا رُخ گلی کے ایک سرے کی طرف ہے اور دوسرے کا رُخ گلی کے دوسرے سرے کی طرف- اقبال کے بقول:

حیراں ہے بُو علی کہ میں آیا کہاں سے ہُوں
رومی یہ سوچتا ہے کہ جاؤں کِدھر کو مَیں

اس شعر میں اقبال نے بو علی، بو علی سینا کو کہا ہے- یعنی بو علی سینا فلسفی ہے اور وہ، یہ جاننا چاہتا ہے کہ میں آیا کہاں سے ہوں؟ مطلب، میری ابتداء کیا ہے؟ میرا آغاز کیسے ہوا؟ کائنات کیسے وجود میں آگئی؟ زندگی کیسے وجود میں آئی؟ وغیرہ وغیرہ- اس کے برعکس رومی جو ایک صوفی ہے، اسے اس بات سے کچھ مطلب نہیں کہ میں کہاں سے آیا ہوں- اسے مطلب ہے تو فقط اس بات سے کہ مجھے جانا کس طرف ہے؟ اقبال کے اور کئی اشعار بھی اسی خیال پر مشتمل ہیں- مثلاً یہ شعر کہ:

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

یعنی فلسفے کے سامنے ابتدا (beginning) کا سوال ہے تو تصوف کے سامنے منزل مقصود (ultimate destination) کا، لیکن دونوں کا منہج زمان و مکاں ہی ہے- تاہم اس بات سے خود فلسفی متفق نظر آتے ہیں کہ فلسفہ تو حُدودِ زمان و مکاں کو عموماً عبور نہیں کرتا جبکہ تصوف عالمِ ہست و بود کی تمام فصیلیں عبور کرتا ہوا بالآخر لازمان و لامکان تک جا پہنچنے کا دعویٰ بھی کرتا ہے-

حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) کے وہ مشہور ابیات کس کو نہیں آتے ہوں گے، جس میں آپ فرماتے ہیں کہ:

کن فیکون جدوں فرمایا، اساں وِی کولے ہاسے ھُو

گویا ہم زمانِ خالص میں وجود رکھتے تھے جو خدا کا زمانہ ہے- زمان و مکاں کے اس عالم کو سلطان باھوؒ "ھاھویت" کا عالم کہہ کر پکارتے ہیں- پھر فرمایا ہمارا امکان بھی وہی تھا جو خدا کا مکان ہے- یعنی کہ لامکان-

ہِکے لامکان مکان اساڈا، ہِکے آن بتاں وِچ پھاسے ھُو

بالفاظِ دیگر حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ انسان کا حقیقی زمان و مکاں، زمانِ خالص اور مکان خالص ہی ہے- لیکن چونکہ ہمیں نفس عطا کر دیا گیا اور اس نفس میں یہ صلاحیت بھی رکھ دی گئی کہ وہ ہمیں گمراہ کر سکے تو اس لیے

وقتی طور پر ہم اپنے اصل زمان ومکاں سے جدا ہو کر زمانِ متسلسل یعنی ماضی، حال اور مستقبل والے زمانے اور مکان میں پھنس گئے ہیں-

یہاں میں اپنا ایک شعر بھی قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گا جو گفتگو کے اس مقام پر میری بات کی وضاحت میں مدد دے سکتا ہے-

میں جس میں دفن ہوں اک چلتی پھرتی قبر ہے یہ
جنم کے وقت ہی دراصل مر گیا تھا میں

مُراد فقط یہ ہے کہ مَیں عالمِ ارواح میں زندہ تھا، لیکن حیاتِ عارضی کے آغاز پہ وہ زندگی مجھ سے عارضی طور پر چھین لی گئی اور مجھے بھول گیا کہ میں کون ہوں اور میں نے ”قالو بلیٰ“ کہہ کر گویا کسی کے ساتھ کوئی وعدہ کر رکھا ہے-

ڈاکٹر حسن فاروقی اپنی کتاب ”میٹا فزکس آف سلطان باہو“ میں لکھتے ہیں کہ: حضرت سلطان باھوؒ اپنے آپ کو ابن عربی کے تنزلات سے متفق پاتے ہیں“-

بالفاظِ دیگر دونوں بزرگ صوفیائے کرام کا تصورِ زمان و مکاں ایک ہی ہے-یہاں تنزلاتِ ستہ کی تفصیل کا وقت نہیں اس لیے میں صرف یہ کہہ کر آگے بڑھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر طرح کے زمان ومکاں سے ماوراً ہے، لیکن صفاتِ الٰہی کا ظہور وشہود زمان ومکاں میں ہی ہوتا ہے- اور اس لیے ہمیں زمانے کے، کم سے کم دو تصورات لازمی طور پر ماننے پڑتے ہیں-ایک وہ جسے حضرت سلطان باھوؒ لازمان و لامکان کہہ کر پکارتے ہیں اور جسے اقبال زمانِ خالص کہہ کر پکارتے ہیں-دوسرا وہ جس میں صفاتِ الٰہی کا ظہور وشہود ہوا- زمانِ خالص سبحان ہے-یعنی قرآنی آیت، ”سُبۡحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ“[1] کے مصداق تمام تر صفات سے پاک ہے-جبکہ دوسرا زمانہ جو بقول کانٹ علیّت کی جان ہے، جو وجود میں آتا ہی تب ہے جب صفات، مشہود یا مینی فیسٹ (manifest) ہوتی ہیں-انسان کا خمیر ان دونوں زمانوں سے اٹھایا گیا ہے- جسمانی طور پر وہ زمان متسلسل میں مبتلا ہے جبکہ روحانی طور پر وہ زمانِ خالص کے ساتھ وابستہ ہے-اقبال نے پہلے خطبے میں لکھا ہے کہ:

”جب صوفی کو خدا کی ذات سرمدی کیساتھ گہری وابستگی نصیب ہوجاتی ہے تو اُس وقت اُسے زمانِ متسلسل کے عدمِ حقیقت کا احساس ہوتا ہے“-

حضرت سلطان باھوؒ کے نزدیک خدا کی معیت میں وقت کا تصور ہی کچھ اور ہے-حضرت سلطان باھوؒ نے عین الفقر میں ایک حدیث پاک درج کی ہے، جس کے الفاظ ہیں:

”لِیۡ مَعَ اللّٰہِ وَقۡتٌ لَا یَسَعُنِیۡ فِیۡہِ مَلَکٌ مُقَرَّبٌ وَّلَا نَبِیٌّ مُرۡسَلٌ“

”یعنی خدا کے ساتھ یا خُدا کی معیت میں میرا ایک ایسا وقت بھی ہے جس میں کسی مقرب فرشتے یا نبی رسول کی کوئی گنجائش نہیں“-

یہ حدیث پاک جہاں رسولِ اطہر (ﷺ) کے بلند مرتبے اور مقام کو واضح کرتی ہے، وہیں زمانِ خالص کی ماہیت پر بھی روشنی ڈالتی ہے-”لِیۡ مَعَ اللّٰہِ وَقۡتٌ“ کے الفاظ، نہایت واضح ہیں-خدا کی معیت میں زمانہ، یقیناً زمانِ ظاہری تو نہیں ہو سکتا کہ سُورج کا طلوع و غروب تو ہمارے لیے ہے-خُدا کا نہ تو کوئی سورج طلوع ہوتا ہے اور نہ ہی غروب کہ وہ اپنے گزرے دنوں کا شمار کرے-خدا کا کوئی ماضی یا مستقبل نہیں ہے-خدا تو ابدی حال (eternal present) ہے-ظاہر ہوا کہ خُدا کی معیت میں گزرے وقت کا شمار چاند سورج کی گردش سے ماوراہے-بالفاظِ دیگر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ”لِیۡ مَعَ اللّٰہِ وَقۡتٌ“ میں وقت کا دورانیہ کتنا تھا؟

حضرت سلطان باھوؒ نے عین الفقر میں ایک روایت بیان فرمائی ہے کہ:

”قیامت کے روز جب عاشقوں کو اللہ تعالیٰ کے سامنے بُلایا جائے گا تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ عاشقو! اب ہمارا دیدار کرلو! ہر فقیر پر تجلی ہو گی اور وہ ستر ہزار سال تک بیہوش پڑا رہے گا اور جب اسے ہوش آئے گا تو وہ پکارے گا ”ھل من مزید“ مجھے اور دیدار چاہیے-اسے

[1] (الصافات:159)

دوبارہ دیدار ملے گا اور وہ پھر ستر ہزار سال کے لئے بے ہوش ہو جائے گا اور ایسا بار بار ہوتا رہے گا‘‘-

معلوم ہوتا ہے کہ ’’لِیْ مَعَ اللہِ وَقْتٌ‘‘ کے الفاظ میں وہ وقت جو رسولِ اطہر (ﷺ) نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ گزارا وہ زمانِ متسلسل کے اعتبار و شمار سے کسی اور ہی مقدار کا حامل ہے کہ آپ تو بے ہوش بھی نہ ہوئے-بقولِ شاعر:

موسیٰ ز ہوش رفت بیک جلوۂ صفات
تُو عین ذات می نگری در تبسمی

’’موسیٰ کے ہوش تو ایک جلوۂ صفات سے ہی اڑ گئے تھے، اور آپ نے عین ذات کو دیکھا اور مسکراتے رہے‘‘-

مولانا روم (رحمۃ اللہ علیہ) کی طرح حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) بھی زمانِ خالص کو ہی ذاتِ حق اور ذاتِ انسانی کا حقیقی زمانہ سمجھتے ہیں-لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تصوف کے اس تصور کو فلسفیانہ سطح پر بھی سمجھا جاسکتا ہے یا اس کا تعلق محض روحانی تجربے کے ساتھ ہے اور فلسفہ اس کی تصدیق میں ناکام ہے؟ اس سوال کا جواب زمانِ متسلسل کی تفہیم میں پوشیدہ ہے-ڈاکٹر وحید عشرت کے بقول مولانا روم کے الفاظ میں، ماضی اور مستقبل تمہارے اور خدا کے درمیان ایک پردہ ہے، اس پردے کو ہٹادو تو تم پر حقیقت آشکار ہو جائے گی-ڈاکٹر وحید عشرت ’’مولانا روم‘‘ کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں کہ:

’’ماضی اور مستقبل دراصل ایک ہی چیز ہیں جسے ہم دو سمجھتے ہیں-جسم ایک ہوتا ہے کوئی اسے باپ کہتا ہے کوئی بیٹا-چھت ایک ہے لیکن اس کے نیچے والے اس کو اُوپر کہتے ہیں اور اُوپر والے اس کو نیچے کہتے ہیں‘‘-

اقبال کے بقول:

شاید کہ ’’زمیں‘‘ ہے یہ کسی اور جہاں کی
تُو جس کو سمجھتا ہے ’’فلک‘‘ اپنے جہاں کا

لیکن ماضی اور مستقبل کا پردہ کیسے ہٹایا جاسکتا ہے؟ رومی کے مطابق ابلقِ ایام پر تصرف سے-ابلق گھوڑے کو کہتے ہیں-ابلقِ ایّام یعنی زمان و مکاں کا گھوڑا-چنانچہ زمان و مکاں کے گھوڑے پر تصرف سے مُراد ہے کہ اِس حیاتِ عارضی میں ابلقِ ایّام کے پیروں تلے روندے جانے کی بجائے ابلقِ ایّام پر سواری کرنا ہو گی-علامہ اقبال اسے اشہبِ دوراں کہہ کر پکارتے ہیں-اشہبِ دوراں کا معنی بھی زمانے کا گھوڑا ہے-اور یہ گھوڑا رام ہوتا ہے تو صرف قوتِ عشق سے-سقراط سے لے کر اقبال تک کتنے ہی فلسفیوں اور کتنے ہی صوفیا نے اِسی اشہبِ دوراں کی سواری ذاتِ انسانی کیلئے لازم قرار دی ہے-غوث الاعظم (رحمۃ اللہ علیہ) ’’فتوح الغیب‘‘ میں فرماتے ہیں کہ:

’’بندہ جب عشق میں مقامِ فنا کو پہنچ جاتا ہے تو اسے کونیات میں تصرف حاصل ہو جاتا ہے‘‘-

لیکن عاشق کا ظاہری وجود چونکہ زمانِ متسلسل کا زندانی ہے اس لیے ماضی اور مستقبل کا نفسیاتی وجود عاشق کا امتحان ہے-حقیقی زمانہ ماضی اور مستقبل سے بے نیاز ہے-زمانہ ایک ہی ہے اور وہی حقیقی ہے-یہ ہماری نظر کا دھوکا ہے کہ ہم اسی حقیقی زمانے کو ماضی، حال اور مستقبل کے ٹکڑوں میں بٹا ہوا سمجھتے ہیں-یہ تو فقط ہماری جسمانی آنکھوں کا بھینگا پن ہے کہ ہم ایک حقیقت کو ایک سے زیادہ حقیقتوں کی شکل میں دیکھتے ہیں-لیکن اگر ہم ماضی اور مستقبل سے بے نیاز ہو جائیں-یعنی ماضی سے صرف سبق سیکھیں، نہ اس کے گُن گائیں اور نہ اس میں مبتلا رہیں تو ہمارا حال بہتر سے بہتر ہوتا چلا جائے گا-حال ہی ابدی حال سے وصال کا متحمل ہو سکتا ہے-حال ہی آگے بڑھنے کا واحد راستہ ہے-

خدا کا مقرب ہونے کیلئے ہمیں اصحابِ شمال یا اصحابِ یمین نہیں بننا-ہمیں صرف السابقون السابقون بننا ہے-یعنی ہمیں دائیں بائیں نہیں مُڑنا بلکہ صراطِ مستقیم پر سیدھا آگے جانا ہے-السابقون السابقون قرآن کے الفاظ ہیں-جس کا ترجمہ ہے، آگے بڑھنے والوں کے کیا کہنے، وہ تو ہیں ہی آگے بڑھنے والے-حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) کے الفاظ میں:

میں قربان تنہاں توں باھو، جنہاں رکھیا قدم اگیرے ھو

اسی طرح ’’عین الفقر‘‘ میں بھی حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ:

’’ذاتِ انسانی ایک کشتی کی مانند ہے جو دنیا کے پانیوں پر تیر رہی ہے-اسے سفر کرنا ہے لیکن سفر کے دوران اس بات کا خیال رکھنا ہے کہ پانی کشتی کے اندر نہ داخل ہونے پائے‘‘-

یہ حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) کا نظریہ حرکت ہے-اسی تصور کو اقبال نے بھی اختیار کیا اور زندگی کو ایک جُوئے رواں قرار دیا جس میں انسان ایک کشتی میں سوار ہے-اسی کو اقبال نے دمادم رواں ہے یم زندگی کے الفاظ سے بھی بیان کیا ہے- زمانے کے گھوڑے کی سواری سے ایسا عشق ہرگز مراد نہیں جو دنیا تیاگ دینے کا درس دیتا ہو-زمانے کے گھوڑے کی سواری کی اصطلاح سے ہی ثابت ہو رہا ہے کہ اِسی مشکلات سے بھری زندگی کا شیروں کی طرح مقابلہ کرنا ہی دراصل عشق کی شناخت ہے- حضرت سلطان باھوؒ نے عشق کے اس تصور کو مزید وسعت بخشی ہے اور فرمایا کہ، ’’فقر علمِ کیمیا پر تصرف کا خزانہ ہے‘‘-بالفاظِ دیگر حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) یہ فرمارہے ہیں کہ علمِ کیمیا بھی علمِ تصوف کا ہی پرتو ہے-اسی بات کو رومی نے بُوئے ناف اور منزل و گام و طواف کے فرق سے سمجھایا اور اسی بات کی تفصیلی وضاحت کے بعد اقبال نے یہ جملہ لکھا کہ:

“The scientific observer of Nature is a kind of mystic seeker in the act of prayer”.

جبکہ محک الفقراء میں حضرت سلطان باھوؒ لکھتے ہیں کہ:

’’خدا کا جاننا اور اس کی صفات کو پہچاننا ہر شخص پر اپنی عقل کے موافق لازم ہے- اس کے لیے کسی کی تقلید ضروری نہیں‘‘-

یہاں جاننا اور صفات کا پہچاننا عالمِ فطرت کا مطالعہ ہے- اسی لیے عقل سے جاننا اور پہچاننا لازم قرار دیا- گویا سائنسدان بھی صوفی ہی ہے جو زمان و مکاں کے مشاہدے میں غرق تو ہے لیکن اس طرح کہ وہ فقط زمانِ متسلسل کا مشاہدہ کرتا ہے- سوار تو وہ بھی اشہبِ دوراں کا ہی ہے، لیکن وہ حقیقت کے ادھورے مشاہدے پر قناعت کر لیتا ہے- رومی تو دنیا کی زندگی کو حدیثِ رسولِ اطہر (ﷺ) کی روشنی میں مزرعۂ پاک کہہ کر پکارتا ہے-

در این خاک در این خاک در این مزرعه پاک
بجز مهر بجز عشق دگر تخم نکاریم

اس خاک میں، اس مزرعہ پاک میں، عشق و محبت کے سوا کوئی بیج نہ بونا- بہر حال مولانا رومیؒ اور حضرت سلطان باھوؒ کے افکار کے تحت زمان و مکاں پر تصرف کے اُصول پر ایمان لازمی ہے-

ہم زمانِ عارضی یا زمانِ متسلسل پر تصرف حاصل کر لیتے ہیں تو زمانِ خالص تک رسائی ہمارے لیے ممکن ہوپاتی ہے اور یہ تصرف فقط استحکامِ خودی سے ہی ممکن ہے-جب خودی مستحکم ہو جاتی ہے تو اس کے لیے زمین و آسمان کے فاصلے ایک جست پر موقوف ہوتے ہیں-وہ خودی حقیقتِ سرمدیہ کا دیدار کر کے بھی اپنے ہوش نہیں کھوتی- بالفاظِ دیگر اپنی ذاتی انفرادیت کے ساتھ قائم رہتی ہے-

علامہ اقبال نے خواجہ عبدالقدوس گنگوہیؒ کا ایک قول اسی ضمن میں نقل کیا ہے کہ:

’’محمدِ عربی برفلک الافلاک رفت و باز آمد
واللہ اگر من رفتمے ہرگز باز نیامدے‘‘

’’یعنی محمدِ عربی (ﷺ) تو فلک الافلاک پر گئے اور واپس آ گئے واللہ اگر میں گیا ہوتا تو کبھی واپس نہ آتا‘‘-

مُراد یہ ہے کہ دیدارِ الٰہی کے بعد واپس اِس دنیا میں لوٹ آنا ہر کسی کے لیے ممکن نہیں ہے- صرف اسی ذات کے لیے ایسا ممکن ہے جس کی خودی مقامِ محمود تک مستحکم ہو چکی ہو، جو لامتناہیت کا مشاہدہ کر کے فنا نہ ہو جائے-

سید نذیر نیازی نے مکتوبات میں لکھا ہے کہ ایک بار ڈاکٹر سید عابد حُسین نے خط کے ذریعے علامہ اقبال سے سوال کیا کہ متناہی خودی کے لیے کیونکر ممکن ہے کہ وہ لامتناہی خودی کے سامنے ٹھہر سکے؟ اقبال نے جواب دیا کہ جیسے دن کی روشنی میں اگر چراغ کو باہر لایا جائے تو اس کی روشنی سُورج کی روشنی میں ضم ہو جاتی ہے لیکن پھر بھی چراغ جلتا رہتا ہے، بالکل ویسے متناہی خودی اگر مستحکم ہو تو لامتناہی خودی کے سامنے بہ استقرار ٹھہر سکتی ہے-

☆☆☆

حضرت سلطان باھُوؒ کا نظریۂ تحرّک و عملیّت پسندی

اَبیاتِ باھُو سے ایک مطالعہ

وسیم فارابی
شعبہ فلسفہ، جی سی یونیورسٹی، لاہور

حضرت سُلطان باھُوؒ ان صوفیا میں سے ہیں جو جہد و تحرک پہ یقین رکھتے ہیں اور ان کی تعلیمات میں جمود و تعطل کی کوئی گنجائش نہیں ہے- وہ چیلنجز سے لڑنا سکھاتے ہیں- لگن اور عشق کے سفر میں انتہا پہ جانا سکھاتے ہیں- مسلسل چلتے چلے جانے کی ترغیب دیتے ہیں- خود بھی زندگی بھر اسی بات کے پیکر رہے کہ 30 برس مرشد تلاش کیا، حالانکہ بیسیوں پیرانِ طریقت سے ملے ان کی کرامات بھی دیکھیں اور کمالات بھی دیکھے مگر رُکے نہیں یہاں تک کہ جو چاہتے تھے وہ پالیا-

جِس مَنزِل نوں عِشق پُچاوے اِیمان نوں خَبر نہ کوئی ھو

مفہوم: جس منزل تک عشق لے جاتا ہے ایمان کو اس منزل کی کوئی خبر نہیں ہے-

ایمان درجات میں ایک بلند درجہ ہے- انہوں نے اسے آزمایا اور اس میں کمال حاصل کیا لیکن یہاں رُکے نہیں بلکہ اس سے اگلی منزل دریافت کرنا چاہی تو معلوم ہوا عشق اس سے بھی آگے ہے جسے حدیث جبریل میں مرتبہ احسان بھی کہا گیا ہے- عشق کے سمندر میں جَست لگادی تو وہاں دل نے ایسے سربستہ رازوں کو پہچانا جو ایمان کے درجے میں رہتے ہوئے نہیں پائے جا سکتے تھے- اس لئے کہا کہ ایمان بھی ضروری ہے مگر عشق ایمان سے بھی آگے کی منزل ہے- مزید غور کریں کہ:

لُوں لُوں دے مُڈھ لکھ لکھ چشماں ہِک کھولاں ہِک کجّاں ھو
اِتنیاں ڈِٹھیاں صَبر ناں آوے ہور کِتے وَل بھجّاں ھو

یہاں بیقراری کی کیفیت انتہا کو پہنچی ہوئی ہے اتنی کہ وہ محبوب کا دیدار صرف ظاہر کی دو آنکھوں سے کر کے خوش نہیں ہوتے بلکہ اندر کی دو آنکھیں بھی روشن کر لیتے ہیں پھر اس پہ بھی دل مطمئن نہیں ہوتا تو اپنے مشاہدے کو مزید وسعت دیتے ہیں اور زیادہ پھیلا دیتے ہیں یہاں تک کہ پورا وجود ہی آنکھ بنا لیتے ہیں اور اپنے ہونے کی تمامیت سے رُخِ یار کا مشاہدہ شروع کرتے ہیں یعنی ”ایک کھولوں اور ایک ڈھانپوں“-اس کیفیت کے بعد جب جسم کے لاکھوں بالوں کے نیچے لاکھوں کروڑوں آنکھیں بن چکی ہیں لاکھوں آنکھیں کھول کر اس کا رُخِ زیبا دیکھ رہے ہیں مگر سیر نہیں ہو رہے- اگر جمود زدہ عارف ہوتا تو دل کی دو آنکھوں سے مشاہدہ کر کے سیر ہو گیا ہوتا- زیادہ سے زیادہ یہاں تک آتا کہ ہونے کی تمامیت سے مشاہدہ کر لیا اب راضی ہوں- لیکن حضرت سُلطان باھُو، چونکہ جمود و تعطل سے پاک عارف ہیں؛ جہد و تحرک پہ اور مسلسل آگے بڑھنے پہ یقین رکھتے ہیں، اس لئے آپ نے اپنے ہونے کی تمامیت سے مشاہدہ کر لیا، پھر اس پہ اکتفا نہیں کیا، یہاں رُکے نہیں بلکہ اس پر بھی عدمِ اطمینان کا اعلان کیا کہ میری طلب مجھے یہاں بھی نہیں بیٹھنے دے رہی اس سے آگے اب میں کہاں کس طرف کو بھاگوں- جن کی زبان پنجابی / سرائیکی / ہندکو نہیں ہے شاید وہ ”ہور کِدے وَل بھجاں“ میں بیقراری کی لاانتہا ہوتی ہوئی کیفیت کو محسوس نہ کر سکیں مگر قریب قریب کے معنوں سے لطف اندوز ضرور ہو سکتے ہیں- یہ بات صرف ایک اس مقام پہ نہیں بلکہ حضرت سُلطان باھُوؒ کی ہمیشہ رہنے والی کیفیات میں ہے اور وہ کئی جگہ اس کا اظہار کرتے ہیں کہ دنیا جسے انتہا سمجھ بیٹھے کہ اب اس سے اوپر کیا ہو سکتا ہے؟ آپ کے نظریہ میں انتہا کو کوئی

دریافت نہیں کر سکا، کسی مقام کو انتہا سمجھنا خام و ناتمام مرتبہ ہے اس لئے آپ کے نزدیک کسی جگہ رکنا نہیں، تھمنا نہیں، ٹھہرنا نہیں- اقبال جسے کہتے ہیں ”حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں“ کہ زندگی آگے بڑھتے چلے جانے کا نام ہے، حضرت سُلطان باھُوؒ کے نزدیک جو تشنہ سیر اب ہو جائے در حقیقت وہ تشنہ تھا ہی نہیں، تشنگی کو بجھانے والی چیز در اصل تشنگی کو بڑھاتی ہے - اس مصرعے کی کیا قیمت ہو سکتی ہے بھلا، جس میں حضرت سُلطان باھُوؒ کہتے ہیں:

دَریا وحدت دَا نوش کیتوسے اَجاں بھی جی پیاسَا ھو

مفہوم: وحدت کا دریا پی لیا مگر جی اسی طرح پیاسا ہے-

اپنی ذات پر یقین، اپنے اندر کی قوتوں کو بیدار کرنا:

ناں کر مِنّت خَواج خِضر دی تیرے اندر آب حیاتی ھو

ہیومنسٹوں (Humanists) کا بھی یہی خیال ہے اور مغرب کے جدید طرزِ زندگی کا یہی فلسفہ ہے کہ اپنے اندر کی حدود (Limits) کو پہچانو تو تم جانو گے کہ تم اَن حد (Limitless) بھی ہو سکتے ہو، کسی کی احتیاج نہ رکھو، اپنا جہان خود تعمیر کرو-

اپنی ذات پر یقین سے متصل ایک دوسرا تصور خود اعتمادی ہے جسے اپنے چاہنے والوں میں حضرت سُلطان باھُو (رحمۃ اللہ علیہ) اس طرح اجاگر کرتے ہیں کہ اگر تو اندر سے مضبوط ہے تو باہر میں اسباب کی کمیاں تیرے اندر کی پختگی سے پوری ہو سکتی ہیں:

توڑے تنگ پُرانے ہووَن گھُٹے نہ رَہندے تازی ھو
نار نَقارہ دَل وِچ وَڑیا کھیڈ گیا اِک بازی ھو

مفہوم: اگر تو اَسپِ تازی (اعلیٰ نسل کا عربی گھوڑا) ہے تو اپنی زین / کاٹھی کے پرانا ہونے کا غم نہ کر- جب میدان میں نقارہ بجے گا تو بازی میں تیرا ہنر اونچا ہی رہے گا-

یعنی تیری زین کا پرانا ہونا (ظاہری اسباب کی قلت ہونا) تیرے اندر کے اصیل ہونے (اندر کے حقیقی جوہر) کے ہنر کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہے- حضرت سُلطان باھُوؒ کے نزدیک دنیا کے میدان میں جیت اندر کی اصلیت پر منحصر ہے نہ کہ نمود و نمائش کے سامان پہ- لہٰذا اگر اپنے اندر کی قوت پہ یقین ہو، اعتماد ہو تو تجھے نہ تو خواجہ خضر سے ہمیشہ کی زندگی والے پانی کی احتیاج ہے نہ ہی دنیا کے میدان میں بازی جیتنے کیلئے اپنی پشت پہ نئی کاٹھی کی- اگر تجھے اپنے آپ پہ اعتماد اور یقین نہیں تو حضرت خضرؑ سے مل بھی لے تو بھی آبِ حیات نہیں ملے گا، پشت پہ نئی اور عمدہ کاٹھی سجا لے تو بھی فاتحِ میدان اَسپِ تازی نہیں بن سکتا-

شوق دا دیوا بال ہَنیرے مَتاں لبھی وَست کھڑاتی ھو

اس میں پہلا احساس تمنا اور شوق کا دیا روشن کرنے کا ہے- دوسرا احساس اپنی کھوئی ہوئی چیز کے ادراک کرنے کا ہے- دونوں کو جوڑیں تو یہ حاصل ہے کہ تم نے جو کھویا ہے اس کا حصول ناممکن نہیں مگر سوال تیرے شوق و طلب کے پیمانے کا ہے؟ کیا اپنی طلب سے اتنے مخلص ہو کہ اس کے حصول کیلئے جان گنوا سکو؟ اتنی دلیری اور ہمت ہے تو جو چاہو پا سکتے ہو، اگر رسک (Risk) نہیں لے سکتے، جان ہارنے کا خوف ہے تو اس دنیا میں تمہاری کوئی جگہ نہیں-

حضرت سُلطان باھُو اپنے مقصود کو حاصل کرنے کی راہ میں جان کی بازی لگانے والوں کو بہت تحسین کرتے ہیں- ان کے چند ایک مصرعوں سے یہ تصور بہت نمایاں ہے-

نام فقیر تَد تھیندا باھُوؒ جَد وِچ طَلب دے مَریئے ھو

مفہوم: تمہیں فقیر (یعنی اپنے ہنر میں "گُرو") کا خطاب تب ملے گا جب اس جدوجہد میں تمہاری جان چلی جائے-

تَدوں فقیر شتابی بن دا جَد جان عِشق وِچ ہارے ھو

مفہوم: فقیر ایک آتش گیر شعلہ تب بنتا ہے جب عشق کی بازی میں اپنی جان گنوا دیتا ہے-

مَیں قُربان تِنہاں توں باھُوؒ جِنہاں خُون بَخشیا دِلبر نوں ھو

مفہوم: میری جان ان لوگوں پر قربان ہو جائے جنہوں نے اپنے محبوب کو اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر دیا-

عَاشقاں دے گل چھُری ہمیشہ باھوؒ اگے محبوب دے کُسدے ھو

مفہوم: عاشق ہمیشہ اپنے گلے میں چھُری لٹکائے (جان ہتھیلی پر لیے) پھرتے ہیں کہ جہاں محبوب کا اشارہ ہو وہیں خود کو قُربان کر دیں-

جِس مرنے تھیں خَلقت ڈردی باھوؒ عاشق مرے تاں جیوے ھو

مفہوم: کسی مقصد میں جان گنوانے سے لوگ عموماً ڈرتے ہیں جبکہ عاشق ایسی موت ہی کو اپنی حیات سمجھتے ہیں کہ اسی موت کے بعد ان کو اصل زندگی ملے گی-

حضرت سلطان باھوؒ مشکل پسندوں کو پسند کرتے ہیں:

اوسے راہ وَل جَایئے باھوؒ جِس تھیں خَلقت ڈَردی ھو

مفہوم: اے باھو! چل اس راہ کی طرف چلتے ہیں جس پر چلنے سے ساری دنیا ڈرتی ہے-

آپ تن آسانی اور تساہل پسندی کی نفی کرتے ہیں- عام لوگ، عام جذبے (passion) اور عام حوصلے کے لوگ انہیں راہوں پہ چلتے ہیں جن پہ نشانِ پا موجود ہوتے ہیں اور کامیابی کی کئی مثالیں موجود ہوتی ہیں- مگر نئی دنیائیں تلاشنے والے لوگ عمومی راہوں سے ہٹ کر چلتے ہیں وہ وہاں سے راہیں ڈھونڈ نکالتے ہیں جن کھائیوں اور گھاٹیوں سے عام لوگ گزرتے ہوئے خوف کھاتے ہیں- اسی تصور کو ایک اور جگہ یوں بیان کرتے ہیں:

جِس دُکھ تھیں سُکھ حاصِل ہووے اُس دُکھ تھیں نہ ڈَریئے ھو

مفہوم: جس دُکھ (مشکل) سے سُکھ (آسانی) حاصل ہو، ایسے دکھ سے ہرگز نہیں ڈرنا چاہیے-

نئی دنیاؤں کی تلاش نئی راہیں کھوج کر ہی کی جاسکتی ہے، جو راستوں کی ناہمواریوں اور چھوٹے چھوٹے خوف دلوں میں پال کر بیٹھے رہتے ہیں وہ بس بیٹھے ہی رہ جاتے ہیں- حضرت سلطان باھُوؒ نے اپنے مقصد کی دُھن میں مشکل راستوں کو چننے والوں کو بہت زیادہ داد دی اور ان کی ہمت کو مثال بنا کر جگہ جگہ پیش کیا ہے- ایک جگہ کہتے ہیں کہ عام لوگوں میں اور سچی لگن یعنی ”عشق“ والوں میں فرق یہ ہوتا ہے کہ عام لوگ ایک زخم ملنے پر راستہ چھوڑ دیتے ہیں جبکہ سچی لگن والے لوگ لاکھوں زخم اٹھا کر بھی اپنی منزل کی جانب رواں دواں رہتے ہیں- جہاں گرنے اور پھسلنے کا خطرہ ہوتا ہے ان کشتیوں پر سوائے لگن والوں کے کوئی سوار نہیں ہوتا- عاشق وہ ہیں جو اپنی کشتیاں پختہ ارادوں کے ساتھ طوفانوں اور گھمن گھیروں سے ٹکرا دیتے ہیں کہ:

بِکی بِکی پیڑ کولوں کُل عالم کُوکے عاشقاں لکھ لکھ پیڑ سَہیڑی ھو
جتھے ڈُھہن رُڑھن دا خطرہ ہووے کون چڑھے اُس بیڑی ھو
عاشق چڑھدے نال صلاحاں دے اونہاں تار کپر وچ بھیڑی ھو

تساہل پسندی، راحت طلب ہو جانے کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ زندگی میں نئے راستے نہ ڈھونڈے جائیں، طوفانوں سے نہ ٹکرایا جائے- اس سے خطرہ مول لینے کی ہمت آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے- انسان صرف پھلوں اور پھولوں کے رَس کا عادی ہو جاتا ہے اور ستاروں پہ کمند ڈالنے کے تحرک سے محروم ہو جاتا ہے- یہی فرق ہے مکھی اور شاہین کی پرواز میں کہ مکھی باغ کی قید میں ہے اور شاہین کے آگے کوئی سرحد یا حد نہیں ہے- حضرت سلطان باھُوؒ فرماتے ہیں:

مکھی قید شہد وِچ ہوئی کیا اُڈسی نال شہبازاں ھو

مفہوم: جو مکھی شہد کی مٹھاس پر عاشق ہو کر اسی کو اپنی زندگی کا مقصد بنا بیٹھتی ہے اسے بھلا کیا خبر کے آسمانوں کی سیر میں کیا لذت ہے- ایسی مکھی شاہین کے ساتھ بھلا کب پرواز کرے گی؟

حضرت سلطان باھُو (رحمۃ اللہ علیہ) طفل تسلیوں کی بجائے عزم وہمت کا درس دیتے ہیں:

بھَار بھرَیرا منزل چوکھیری اوڑک ونج پہنچیسوں ھو

مفہوم: بوجھ بہت زیادہ تھا، منزل بہت مشکل بھی تھی اور دور بھی، بالآخر ہم منزل پر پہنچ ہی گئے-

اس مصرعہ سے بھی واضح ہے کہ حضرت سُلطان باھُوؒ کے فلسفہ حیات میں زندگی کی ذمہ داریوں سے فرار یا سہل پسندی اختیار کرنے کی کوئی راہ نہیں- حضرت سُلطان باھُوؒ زندگی کی ذمہ داریوں سے فرار نہیں ہونے دیتے بلکہ بار بار احساس دلاتے ہیں کہ انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی تک ہر ایک ذمہ داری کو ادا کرنے کا بوجھ تمہارے

کندھوں پہ ہے جس سے انکار یا فرار کی کوئی راہ نہیں ہے- اگر تسلی مانگتے ہو کہ کوئی بات نہیں منزل قریب ہے یا راستہ آسان ہے تو ایسی کوئی طفل تسلی زندگی میں نہیں ہوتی- ولیم ارنسٹ ہینلے(William Ernest Hanley) کی نظم انوِکٹس(Invictus) کا اختتام بھی اسی فلسفے پہ ہوتا ہے کہ

"I am the master of my fate, I am the captain of my soul".

"اپنی قسمت کا معمار میں خود ہوں اور اپنی زندگی کا کپتان میں خود ہوں"-

ارنسٹ ہینلے کی اسی نظم سے متاثر ہو کر مغرب میں اس فلسفۂ زندگی کو مقبولیت ملی کہ:

"Be the captain of your own ship"

یعنی اپنے زندگی کے جہاز کی ساری ذمہ داری تمہارے اپنے اوپر ہے- بھاری بوجھ مشکل راستے، ایک ہی طریقہ ہے کامیابی کا کہ دلیری سے اس بوجھ کو اٹھاؤ اور مشکل راستے طے کرتے جاؤ، طوفانوں، قزاقوں، رہزنوں اور دشمنوں سے لڑتے ہوئے آگے جاؤ تبھی منزل کو پا سکتے ہو- آپ نہ صرف زندگی کو ہمت اور دلیری سے گزارنے کا سبق دیتے ہیں بلکہ آزمائشوں کی گلہ مندی اور شکوے سے بھی منع کرتے ہیں کہ:

بَر سر آیاں دَم ناں ماریں جاں سر آوے سختی ھو

یعنی زندگی کی ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے جب سختی سر پہ آن پڑے تو دَم نہ مارنا یعنی شکوہ نہ کرنا- کیونکہ راہِ عشق و حیات میں شکوہ کرنا کم ہمتی اور ارادے کی ناپختگی کی دلیل ہے- اقبال کے الفاظ اسی تصور کو لے کر دلوں میں ہمت کا رَس گھولتے ہیں:

جو فقر ہوا تلخیٔ دوراں کا گلہ مند
اُس فقر میں باقی ہے ابھی بوئے گدائی

کسی مقام پہ نہ ٹھہرنا، کسی چیز پہ اکتفانہ کرنا، کسی درجے کو انتہا نہ جاننا، کسی جگہ پائے ہمت کو نہ روکنا حضرت سلطان باھُوؒ کے اصولوں میں سے ایک نمایاں اصول ہے- آپ نے

اپنے ابیات میں آگے سے آگے بڑھتے چلے جانے کی ترغیب دی ہے- اس پنجابی مقولے کے مصداق کہ "رُک ویسیں تاں مُک ویسیں"، یعنی اگر رُک جاؤ گے تو ختم ہو جاؤ گے- اقبال کا بھی یہی فلسفہء حرکت ہے کہ "ہستم اگر می رَوَم، گر نہ رَوَم ، نیستم" اگر میں آگے بڑھ رہا ہوں تو میں ہوں اگر رک جاؤں تو میں نہیں ہوں- حضرت سلطان باھُوؒ بھی ایسے ہی لوگوں کی تحسین کرتے ہیں جو اقبال کی 'ہستم اگر می رَوَم' کی پیروی کرتے ہیں- دو مختلف ابیات سے دو مصرعے دیکھئے کہ انہوں نے کیسا شاندار اور قابلِ تقلید تصورِ زندگی دیا ہے:

میں قربان تنہاں توں باھو، جنہاں رکھیا قدم اگیرے ھُو

مفہوم: میری جان ایسے لوگوں پر قربان جو منزل کی طرف قدم بڑھاتے رہے اور پیچھے مُڑ کر بھی نہیں دیکھا-

ثابت صِدق تے قَدم اگیرے تائیں رَبّ لبھیوے ھو

مفہوم: اگر تم خدا کو پانا چاہتے ہو تو اپنے مقصود و منزل کے ساتھ اپنا دِلی تعلق پختہ رکھو اور اسکی طرف گامزن رہو-

حضرت سلطان باھُوؒ کے فلسفہ و تصوف میں جمود، تعطل ، ٹھہر جانے، رک جانے اور حرکت و عمل سے غافل ہونے کا نشان تک نہیں ملتا، آپ کا فلسفۂ حیات ان خرافات سے پاک ہے- آپ کے خیال میں لگن کی راہ میں کچھ رکاوٹیں انسان کے اندر سے اٹھتی ہیں اور کچھ رکاوٹیں انسان کے باہر سے، جسے اپنے کام کی لگن سچے دل سے لگی ہو وہ ان دونوں کو عبور کر جاتا ہے- اس کیلئے اندر کی رکاوٹیں دن رات، بھوک، پیاس، نیند حتیٰ کہ موت وغیرہ بھی کوئی رکاوٹ نہیں رہ جاتے:

راتیں رَتی نیندر نہ آوے دِہاں رہے حیرانی ھو

مفہوم: میرا دن اپنے مقصود کی جستجو کے لئے فکر و تدبر میں تو گزرتا ہی ہے لیکن میں اس فکر میں اتنا غرق ہوتا ہوں کہ مجھے رات کو ایک پل کیلئے نیند بھی نہیں آتی-

عاشقاں نیندر بُھکھ ناں کائی عاشق مُول نہ مَردے ھو
مِثل سکندر ڈُھونڈن عاشق اِک پلک آرام نہ کردے ھو

مفہوم: عاشق اپنے مقصود کی تلاش میں اس طرح غرق رہتے ہیں کہ دنیوی ضروریات مثلاً کھانا، پینا، سونا، جاگنا وغیرہ ان کی جستجو کے آڑے نہیں آتیں- جس طرح سکندر نے آبِ حیات کو پانے کیلئے دن رات ایک کر کے اپنی نیندیں قربان کر دیں اسی طرح عاشق بھی اپنے مقصود کی تلاش میں ان آسائشوں سے بے نیاز ہو کر سر گرداں رہتے ہیں-

درج بالا تو ہمارے اندر کی رکاوٹیں تھیں، اگر شوق اور لگن میں سچائی ہو تو باہر کی رکاوٹیں بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتیں:

اوجھڑ جھل تے مارُو بیلے اِتھے دم دم خوف شیہاں دا ھو
تھَل جَل جنگل گئے جھگیندے باھوؒ کامل نینھ جِنہاں دا ھو

مفہوم: گہرے جنگل، خوفناک صحرا اور دریائی گزرگاہیں جن میں ہر وقت شیروں یعنی درندوں کا خوف ہے، مگر اے باھُو جس کا شوق کامل ہو وہ تھل یعنی صحراؤں سے، جل یعنی دریاؤں سے اور جنگلوں سے کامیابی سے پار نکل گئے-

گویا سچی لگن اور مسلسل محنت و ہمت ایسے ہتھیار ہیں جو اندرونی اور بیرونی دونوں قسم کے دشمنوں کو مٹا دیتے ہیں-

سچائی ثابت کرنے کیلئے جان کی بازی لگانا:

اپنے علم و ہنر میں جان کی بازی لگائے بغیر کمال حاصل نہیں کیا جا سکتا- اس لئے وہ کئی مقامات پہ نصیحت کرتے ہیں کہ جس راہ کو تم نے اپنے زندگی کے مقصد کیلئے چن لیا ہے اس راہ میں جان کی پرواہ نہ کرو- عین ممکن ہے تمہیں اپنا سچ جان کی بازی لگا کر ثابت کرنا پڑے- حضرت سلطان باھوؒ نے کئی جگہ کہا ہے کہ جب ایسا موقع آجائے تو پیچھے نہ ہٹو، دیر بھی نہ کرو، خوف بھی نہ کھاؤ بلکہ دلیری اور شجاعت کے ساتھ سر اونچا رکھے سینہ تانے اپنے مقصد کیلئے نثار ہو جاؤ-

سِر دِتیاں جے سِرّ ہتھ آوے سَودا ہار نہ توہاں ھو

مفہوم: اگر سر دے کر (جان دے کر) مقصود حاصل ہوتا ہے تو اس سودے بازی میں ہرگز نہیں ہارنا بلکہ جان دے کر اپنا مقصود حاصل کر لینا-

جے سِر دِتیاں حق حاصل ہووے باھوؒ اُس مَوتوں کی ڈَرناں ھو

مفہوم: اگر سر دے کر (جان دے کر) حق حاصل ہوتا ہے تو ایسی موت سے ہرگز نہیں ڈرنا-

باھوؒ جے صاحب سر منگے ہرگز ڈِھل نہ کریئے ھو

مفہوم: اے باھو! اگر محبوب جان مانگے تو ہم نے ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کرنی-

عِشق دی بازی اُنہاں لئی جِنہاں سر دِتیاں ڈِھل ناں کیتی ھو

مفہوم: عشق کی بازی وہ لے گئے جنہوں نے جان دینے میں ایک لمحہ بھی تاخیر نہیں کی-

حضرت سلطان باھُوؒ کے اس تصور کی گونج فیض احمد فیض کے اس شعر میں واضح سُنائی دیتی ہے، بلاشبہ جو اردو زبان کے بہت معروف شعروں میں سے ایک ہیں-

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں

حضرت سلطان باھُوؒ کی رائے میں اپنی لگن کو اس خوف سے ادھورا مت چھوڑو کہ کہیں راستے میں تہہِ تیغ نہ کر دیئے جاؤ، آپ کہتے ہیں بھلے تہہِ تیغ ہی ہونا پڑے مگر لگن سے منہ نہ موڑو- جس میں لگن کی تکمیل ہو رہی ہے اس سمت بلا خوف و خطر اپنا سفر جاری رکھو- اس میں رول ماڈل کے طور پہ حضرت امام حسینؓ کی مثال دیتے ہیں کہ جیسے وہ حق کیلئے شہید ہو گئے تم بھی امر ہونا چاہتے ہو تو اپنے مقصد سے کبھی پسپا نہ ہونا-

عاشِق سوئی حقیقی جہڑا قتل معشوق دے منّے ھو
عِشق نہ چھوڑے مُکھ نہ موڑے توڑے سے تلواراں کھنّے ھو
جِت وَل ویکھے راز ماہی دے لگے اوسے بنّے ھو
سچّا عِشق حسینؓ علیؓ دا باھوؒ سِر دیوے رَاز نہ بھنّے ھو

مفہوم: سچا عاشق وہی ہے جو معشوق کیلئے قتل ہو جانے کو دل و جان سے قبول کرے، چاہے وہ زخموں سے چُور چُور ہو جائے

لیکن وہ نہ ہی اپنا عشق چھوڑے اور نہ ہی اپنے مقصد سے نگاہیں ہٹائے بلکہ جس طرف اسے اپنے مقصد کی جستجو لے جائے وہ اسی راہ کی طرف بھاگ دوڑے-اس لیے حضرت امام حسین (رضی اللہ عنہ) کا عشق سچا عشق تھا جنہوں نے اپنا سر کٹوا دیا لیکن اپنے مقصد سے پیچھے نہیں ہٹے-

راحت طلبی و آسائش پسندی کی نفی:

راحت طلبی اور آسائش پسندی کو حضرت سلطان باھُو (رحمۃ اللہ علیہ) کے فلسفے میں زہرِ قاتل سمجھا جاتا ہے-وہ جب فقیر کو نصیحت کرتے ہیں کہ اگر حق کی راہ میں کمال حاصل کرنا ہے تو اسے یہی مشکل پسندی، جفاکوشی اور جان گدازی کا مشورہ دیتے ہیں-اس تصور پہ ایک بیت دیکھیں:

دُودھ تے دَہی ہر کوئی رِڑکے عاشق بھَا رِڑکیندے ھو
تَن چَٹُورا مَن مَندھانی، آہیں نال ہلیندے ھو
دُکھاں دا نیترا کڈھے لِسکارے غماں دا پانی پیندے ھو
نام فقیر تِنہاں دا باھوؒ جیہڑے ہڈاں توں مکھن کڈھیندے ھو

مفہوم: دودھ اور دہی تو ہر کوئی بلوہ لیتا ہے، سچی لگن تو ان کی ہوتی ہے جو آگ بلوہتے ہیں-(جس طرح دودھ اور دہی بلوہنے کیلئے خارج میں برتن ہوتا ہے اسی طرح) آگ بلوہنے کیلئے اپنے جسم کو بڑا برتن بناتے ہیں اور اس میں اپنے من کو مندھانی بناتے ہیں (یعنی تن من سے وہ اپنی لگن کی آگ میں جل رہے ہوتے ہیں)-جب دکھوں اور مشکلوں سے گزر کر وہ آگ کا مکھن سامنے آنے لگتا ہے تو پھر اس میں اپنی آہوں کا پانی شامل کرتے ہیں-اے باھُو! فقیر تو کہتے ہی اس کو ہیں جو (تن آسانی ترک کر کے) اپنی ہڈیوں سے (آگ کا) مکھن نکالتے ہیں-

حضرت سلطان باھُو کا فلسفہ تحرک اور علمی جستجو:

حضرت سلطان باھُو (رحمۃ اللہ علیہ) تصوف کے عالم بھی تھے اور عامل بھی، ان کی نصیحت بظاہر اسی راہ پہ چلنے والوں کو مخاطب کر کے ہے-لیکن، یہ نصیحت علم کی ہر برانچ میں آگے بڑھنے والوں کیلئے ایسی ہی کارگر ہے کہ جب تک کسی علم میں ہمت اور مشقت کے ساتھ جان گدازی کے مراحل سے نہ گزرا جائے اس کی آگ کی تپش پیدا نہ ہو تب تک اس علم میں کمال حاصل نہیں کیا جا سکتا-اگر سائنس یا فلسفہ کی بات کریں تو بھی کیسی سَچی اور سُچی مثال ہے کہ ”ہڈیوں سے مکھن نچوڑ“ کر ہی کسی ہنر کا گُرو بنا جا سکتا ہے-

اس گزشتہ بیت میں حضرت سلطان باھُوؒ نے ہڈیوں سے مکھن نکالنے کے استعارے سے مشکل پسند ہونے کا درس دیا ہے-ایک جگہ پہ آپ نے اپنے فن میں کمال کو پہنچے ہوئے شخص کی نشانی یہ بیان کی ہے کہ اس کے جسم سے گوشت الگ ہو جاتا ہے اور کمزوری کے باعث صرف ہڈیاں جھول رہی ہوتی ہیں:

تَن تھیں مَاس جُدا ہویا باھوؒ سوکھ جھلارے ہڈیاں ھو

ایک اور مقام پہ آپ نے کہا ہے کہ سچی لگن والا شخص وہ ہوتا ہے جو اپنی لگن کی آگ میں اپنی ہڈیوں کو ایندھن کی طرح جلاتا رہتا ہے، اپنی جان اور جگر کو محنت کی آری چلا کر کباب بناتا ہے، اپنی لگن کی تکمیل میں دنیا اور اہلِ دنیا سے بے نیاز ہو کر ہر وقت سرگرداں لگا رہتا ہے اپنے جگر کا خون پیتا رہتا ہے-بیت ملاحظہ ہو:

عِشق دی بھَاہ ہڈاں دا بَالن عَاشِق بیھ سِکیندے ھو
گھت کے جان جِگر وچ آرا ویکھ کباب تلیندے ھو
سرگردان پھِرن ہر ویلے خُون جِگر دا پیندے ھو

”خونِ جگر“ کی ترکیب سے اقبال کی مسجد قرطبہ یاد آگئی کہ ”معجزۂ فن کی ہے خُونِ جگر سے نمود“ اور اسی نظم کے اختتام میں ہے کہ ”نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر“-

جگر کو خُون کئے بغیر مقصد کو حاصل نہیں کیا جا سکتا، جسم و جان کو پگھلا دینے والے مراحل سے گزرے بغیر انسان

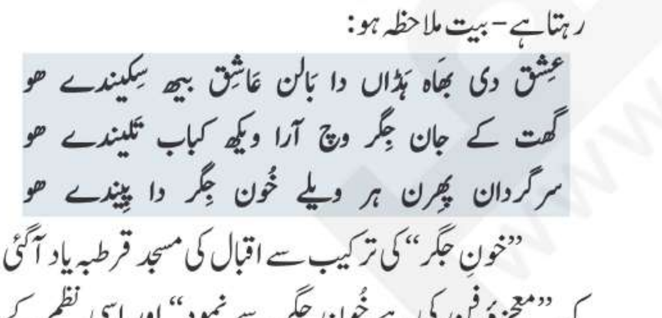

اپنے ہنر میں کمال نہیں پا سکتا- اسے روز مرّہ کی کئی عام فہم مثالوں سے حضرت سلطان باھُو نے واضح کیا ہے - وہ کہتے ہیں کہ جب تو لوہے کہ طرح لوہار کی بھٹی اور ہتھوڑے کی مار کھا لے گا تب تلوار بنے گا- جب لکڑی کی طرح تیرے جسم کو بار بار چیز کر باریک کیا جائے گا تب تو محبوب کی زلف میں پھیری جاسکنے والی کنگھی بن سکے گا- مہندی کے پتوں کے طرح تجھے پیس پیس کر چھوٹے چھوٹے ذرات میں بدل دیا جائے گا تب تجھے محبوب کی ہتھیلی پہ لگایا جائے گا- کپاس کی طرح جب تک تجھے کات کات کر دھاگہ دھاگہ کرکے نئے سرے سے بُنا نہیں جائے گا تب تک بادشاہ کے سر پہ باندھے جانے والی دستار نہیں بن سکتا:

لوہا ہوویں پیا کُٹیویں تاں تلوار سڈیویں ھو
کنگھی وَانگوں پیا چِریویں تاں زُلف محبوب بھَریویں ھو
مہندی وَانگوں پیا گھُوٹیویں تاں تَلّی محبوب رنگیویں ھو
وَانگ کپاہ پیا پنجیویں تاں دَستار سڈیویں ھو

ایک دوسرے مقام پہ آپ نے سونے کے زیورات سے مثال دی کہ جب تک سونا تیزاب میں دھو نہ لیا جائے تب تک تو محبوب کے کان کا بُندا نہیں بن سکتا (اس مصرعہ میں کھٹہ سے مراد تیزاب ہے سناروں کی پنجابی اصطلاح میں ”کھٹہ“ تیزاب کو کہتے ہیں)-

کنیں خُوباں دے تدوں سُہاون جدوں کٹھے پا اُجالے ھو

حضرت سلطان باھُوؒ کہتے ہیں کہ ہمت و شجاعت کے ساتھ لگن اور شوق کے سمندر میں تیراکی کیلئے اترنا چاہئے- اور جس جگہ ”اونچی لہریں اور غضب کی ٹھاٹھیں“ پڑ رہی ہوں وہیں پہ قدم جا کر رکھو اور وہیں اپنی ہمت آزماؤ وہیں اپنا آپ ثابت کرو- اپنے مقصد کے حصول کیلئے خوفناک جنگلوں، ان میں رہنے والے درندوں اور دریائی گزر گاہوں کی خوفناکیوں کو دیکھ کر ڈرنا اور گھبرانا نہیں چاہئے- گر تو تم تبھی کہلا سکتے ہو جب اپنی لگن کی راہ میں ہی مارے جاؤ!

عِشق دَریا محبّت دے وِچ تھِی مَردانہ تَریئے ھو
جِتھّے لہر غضب دِیاں ٹھَاٹھاں قَدم اُٹھائیں دھریئے ھو

اوجھڑ جھنگ بلائیں بَیلے ویکھو ویکھ نہ ڈریئے ھو
نام فقیر تد تھیندا باھوؒ جد وِچ طلب دے مَریئے ھو

اختتامیہ:

حضرت سلطان باھُو (رحمۃ اللہ علیہ) کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی مقام پہ رکنا طلب کا عیب سمجھتے ہیں- ان کے نزدیک زندگی ایک جہدِ مسلسل سے عبارت ہے- انسان کو اللہ پہ توکل کرنا چاہئے اور اپنا زورِ بازو آزمانا چاہئے کہ یہ دنیا ہمت والوں کی دنیا ہے- کسی بھی ہنر میں تب تک کمال حاصل نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ شوق اور عشق کے ساتھ اس ہنر کی تہوں میں نہ اتر جایا جائے- آپ کے نظریہ کے مطابق ایک عظیم شخصیت کی تعمیر کیلئے سخت مراحل اور کڑے امتحانوں سے گزرنا پڑتا ہے جیسے تلوار بننے کا عمل لوہے کو کان سے نکال کر آگ اور ہتھوڑے کی اذیت سے گزارتا ہے، اگر لوہا اس سے فرار اختیار کرے تو وہ تلوار نہیں بن سکتا- یہی حالت کسی بھی قوم یا طبقے کے رہنما کی ہوتی ہے- آپ کے نزدیک زندگی میں کامیاب وہی ہوتے ہیں جو عملِ پیہم اختیار کرتے ہیں اور بے عملی سے اپنے دامن کو آلودہ نہیں کرتے - اپنی لگن میں سچے ہوتے ہیں، اپنے مقصد کے حصول کیلئے ان کے دل میں کوئی خوف نہیں ہوتا، حتیٰ کہ اگر موقع آ جائے تو ایسے لوگ حضرت امام حسین (رضی اللہ عنہ) کے نقشِ قدم پہ چلتے ہوئے اپنی جان کو مقصد پر قربان کر دیتے ہیں-

پر صادق دین تنہاں دے باھوؒ جو سر قُربانی کردے ھو

☆☆☆

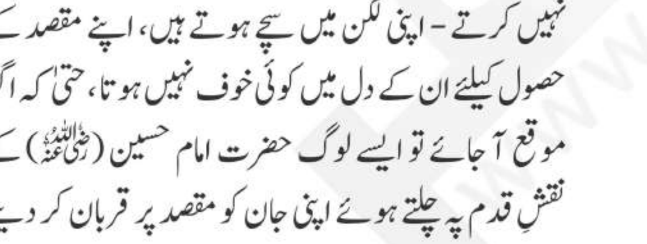

جنہاں عشق نہ خرید کیتا باھو

ڈاکٹر رشد اللہ شاہ (مخمور بخاری)
اسٹنٹ پروفیسر، شعبہ سندھی، سندھ یونیورسٹی، جامشورو

تصوف کی کوئی بھی زباں نہیں ہوتی-وہ ہر زباں میں اپنی آھنگ کے دھنک سے سالک کے باطن کو لطیف بنا دیتا ہے- ایسا حسین و جمیل کے سارے رنگ اس پر اتر آتے ہیں- ایسا لطیف کے پنکھڑیوں کے نرماہت بھی خود کو ان کے سامنے اپنا جمال بے رنگ محسوس کرے- بھلا ایسا کیوں نہ ہو- جب پوری کائنات سمٹ کر اس خاکی قبا کے اندر اپنی ایک الگ ہی کائنات بنا بیٹھے، ایسی کائنات جس میں ”وہ“خود ہی اپنا بسیرا کرے- سالک کا یہ سفر جتنا کٹھن، تکلیف دہ، جفاکشی، جد و جہد، جستجو، حیرانی پے مبنی ہوتا ہے اتنا ہی یہ سفر اپنے ایک نئیں موڑ پہ لطیف و کومل بن جاتا ہے، پھر سالک خود نہیں رہتا، وہ ”وہ“ بن جاتا ہے- عکس--- پسِ عکس!---یہ تو سالک ہی سمجھے یا مالک!

حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ)، تصوف کے اس منزل پہ موجود ہیں، جہاں ان کے سامنے رنگ برنگی دنیا اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھی ہے، ان کے لئے ساری خوشبوئیں، سارا حسن، اپنی محدود پیرا ہی میں سکڑ کر ان کے تابع بن جاتا ہے-وہ خود حسین و جمیل بن جاتے ہیں-ان کے اندر بے پناہ خوشبوؤں کا جہاں زندہ رہنا شروع کرتا ہے-وہ شگوفے کی طرح لطیف بن گئے ہیں-

سالک کا ”لطیف“ تک کا سفر متعین نہیں- کیفیات، جذبات، حالات، محسوسات، وقت کچھ بھی مقرر نہیں- خود سے خود کا سفر اتنا حیران کن بھی ہو سکتا ہے، یہ خبر اس سفر کے دوران ہی محسوس ہو شاید انسان کیفیات و جذبات کا ایک بڑا جہاں اپنے اندر دبا کر جیتا ہے-اسے وہ، معلوم نہیں کہ اس کے اندر کیا کیا ہے؟ وہ خود کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اس کے نہ ہونے سے کیا ہے؟ اس ہونے اور نہ ہونے کے بیچ کیا ہے؟ کچھ ہے بھی یا کچھ بھی نہیں-اگر وہ نہیں ہے تو بھی تو وہ ہے- اگر وہ ہے تو وہ نہیں ہے-خود کا خود تک سفر سالک کو یہ نقطہ ہی سمجھنے کے قابل بناتا ہے-کیا سالک کو قابل بننا ہے! قابلیت کیا ہے! حروف الفاظ کی شناس، خیال تک کی دسترس، فکر و فہم کا دعویٰ، یا عاجزی، نیاز، محبت، اخلاص، قربت، احترام، ہستی کے وجود کے دعویٰ سے دستبرداری، تکبر سے دوری اتنی دوری کہ وجود اس کا متضاد نظر آنا شروع ہو جائے-کیا ہے یہ قابلیت؟ جس کے ظاہری رنگ رو سے سندھ کے صوفی شاعروں سے لے کر شاہ حسین، حضرت سلطان باھو، بابا بلھے شاہ، خواجہ فرید (رحمۃ اللہ علیہم) تک کے شاعروں، عالموں نے عام ظاہری رنگ و روپ سے انکار کیا ہے-

پڑھ پڑھ عالم کرن تکبر حافظ کرن وڈیائی ھُو
گلیاں دے وچ پھرن نماٹے وتن کتاباں چائی ھُو
جتھے ویکھن چنگا چوکھا اوتھے پڑھن کلام سوائی ھُو
دوہیں جہانیں سوئی مٹھے باھُوؒ جنہاں کھادھی ویچ کمائی ھُو

علم کا ایک یہ ظاہری روپ ہے جو انسان کو خود سے ملنے نہیں دیتا- وہ درخت میں لگے پھل کی جھکی ہوئی ٹہنی کے بجائے تکبر بن کر انسان کو خود سے دور کر دیتا ہے- کیونکہ جس سفر میں محبت کا عنصر موجود نہ ہو وہ سفر تھکا دینے والا سفر ہوتا ہے اور جس میں محبت شامل ہو جائے اس سفر میں آنے

والی مشکلات بھی تکلیف کے احساس سے عاری ہوتی ہیں-

حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں:

پڑھ پڑھ علم ہزار کتاباں عالم ہوئے بھارے ھُو
اک حرف عشق دا پڑھن نہ جانن بھلے پھرن بچارے ھُو
اک نگاہ جے عاشق ویکھے لکھ ہزاراں تارے ھُو
لکھ نگاہ جے عالم ویکھے کسے نہ کدھی چاہڑے ھُو
عشق عقل وچ منزل بھاری سئے کوہاندے پاڑے ھُو
جنہاں عشق خرید نہ کیتا باھُوؒ اوہ دوہیں جہانیں مارے ھُو

حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائی (رحمۃ اللہ علیہ) (1690ء-1752ء) فرماتے ہیں:

پڙهيو تا پڙهن، ڪڙهن ڪين قلوب سين،
پاٽان ڏوهه چڙهن، جئين ورق ورائن وترا

”وہ پڑھتے تو خوب ہیں، مگر الفاظ کی معانی (جو اس کا جوھر ہے) تک نہیں پہنچتے-(وہ جانتے ہیں) جو جو صفحے الٹتے جاتے ہیں ان کے گناہ بھی بڑھتے جاتے ہیں“-

صوفی شاعر سچل سرمست (1739ء-1827ء) بھی کچھ اس طرح کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

سڪ سچي کون ڪونڪو، سبق سور سکن
اکر لکن نه دل تي، تا ڪاغذ ڪارا ڪن
مس ڪاري جان من کي، تا ڪاري ڪارو ڪن
مدعا جنهن مام جي، تنهن ويجهو ڪين وڃن
تاڏي ڪن نه ڪن، جو فرمودو فائق جو

”وہ علم کی حاصلات میں عشق کا درد شامل نہیں رکھتے، وہ حروف لکھتے ہیں معانی کے سوا وہ سیاہی کی طرح اپنے اندر کو بھی سیاہ کر رہے ہیں-وہ حقیقت کے قریب ہی نہیں جاتے-وہ اس طرف دیکھتے بھی نہیں جہاں سے اصل کی پہچان ہوتی ہے“-

قاضی قادن (870ھ-1445ء-958ھ-1551ء)

سندھی زبان کے پہلے صوفی شاعر مانے جاتے ہیں- جو حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) سے تقریباً اک صدی قبل انہیں خیالات کا اظہار کر گئے ہیں-

ڪنز قُدوري، ڪافيه، جي پڙهي پروڙين سيپ
گه منڍي ماڪوڙي، کوهه مان ڪيچي اُپ

”بظاہر تم نے فقہ اور صرف و نحو کی اہم کتابیں (کنز، قدوری اور قافیہ) پڑھ لیں ہیں، پھر بھی (تمہارا علم اتنا مختصر ہے) تم کنویں کے مینڈک کی طرح اندر سے آسمان کی وسعت ناپ رہے ہو“-

حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) اپنی ایک تصنیف ”رسالہ روحی شریف“ میں کھتے ہیں:

گرچه نیست مارا علم ظاہر
ز علم باطنی جاں گشته طاہر

”اگرچہ ظاہری علم میں نے حاصل نہیں کیا، تاہم علمِ باطن حاصل کر کے میں پاک و طاہر ہو گیا ہوں اِس لئے جملہ علوم بذریعہ انعکاس میرے دل میں سما گئے ہیں“-

برصغیر پاک و ہند میں قرآن پاک کے پہلے فارسی مترجم اور مفسر، سلسلہ اویسیہ کے بزرگ حضرت مخدوم نوح (رحمۃ اللہ علیہ) (ہالا، سندھ) (1505ء-1588ء) اپنے ایک سندھی ابیات میں لکھتے ہیں:

اُپٽيان تہ انڌيون، پوريون پرين پسن،
آهي اکڙين، عجب پر پسڻ جي.

”آنکھیں کھولوں تو کچھ دکھائی نہیں دیتا اور بند کروں تو محبوب کو دیکھتا ہوں-ان آنکھوں کے دیکھنے کی اس ادا پہ حیراں ہوں“-

تمام صوفیائے کرام (تزکیہ کے بغیر حاصل ہونے والے) ظاہری علم کی نفی کرتے ہیں-ان کے نزدیک علم کے دورُخ یا طبقے ہیں ظاہر و باطن- ظاہری حالت وہ جس میں چیزیں اس طرح نظر آئیں جس طرح وہ موجود ہوں- باطنی حالت: جس میں ان چیزوں کے محرکات و حرکات کا علم ہو-

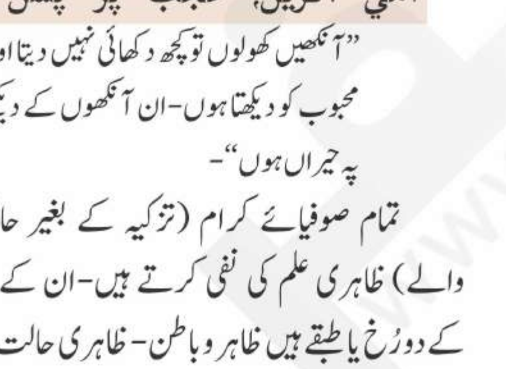

چیزوں کے ہونے اور نہ ہونے کے اسباب، مقاصد اور اہمیت کا پتا چلے -زباں کے سائنسی علم ساختیات کے مطابق الفاظ خود میں بے معنٰی ہے- اسے معانی کی جلا اس میں چھپے احساسات و کیفیت بخشتی ہے- یعنی الفاظ کے معانی اس کے اندر پوشیدہ ہیں- جب تک اسے کھوج کر حاصل نہیں کیا جاتا، تب تک وہ الفاظ پڑھنے والے کے لئے کچھ بھی نہیں، یعنی علم کا ظاہر سالک کو کامل نہیں بننے دیتا- سطحیت بہت بڑی رکاوٹ ہے گہرائی کے اندر جھانکنے میں- ہم جب سطحیت پر رُک جاتے ہیں تو اس کے اندر کیا ہے- ہم اس سے بے خبر ہی نہیں اس سے لاتعلق بھی بن جاتے ہیں- ایسے لاتعلق کے ہم نظر آنے والی چیزوں کو ہی سب کچھ سمجھ بیٹھتے ہیں، خیال کے جوہر تک رسائی ہر حالت میں اہمیت رکھتی ہے- کیونکہ وہ جوہر ہی ہے جو قائم رہنا ہے- خیال کی بقا اس کے اندر موجود اس کے روح/گہرائی یا جوہر میں ہے- سالک جب تک علم کے اس درجے تک جانے کی کوشش نہیں کرے گا تب تک اس کا سفر، اس کی حاصلات، کامیابی کبھی بھی بامقصد نہیں بن سکتی- اسے اپنے سفر کو بامقصد بنانے کیلئے اخلاص، محبت، خلوص، احترام جیسے جذبوں، کیفیتوں کو اپنے اندر سمو کر چلنا پڑے گا- کیونکہ یہ علم کے سفر کے وہ ثمر ہیں جو طالب کو علم کی جوہر تک رسائی تک والی مسافت میں آسانی پیدا کرتے ہیں-

شاہ عبد اللطیف بھٹائی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں:

اکر پڑھ الف جو بیا ورق سپ وسار.
اندر تون اجار،پنا پڑھندین کیترا.

”الف کا حروف پڑھ اور سارے ورق (کاغذ) بھول جا،
اپنی اندر کو روشن کر، تم کتنے ورق (کاغذ) پڑھو گے“-

شاہ عبد اللطیف بھٹائی (رحمۃ اللہ علیہ) کے ہم عصر بابا بلھے شاہ (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں:

الف اللہ رتا دل میرا مینوں 'ب' دی خبر نہ کائی
'ب' پڑھیا مینوں سمجھ نہ آوے لذت الف دی آئی
'ع' تے 'غ' نوں سمجھ نہ جاناں گل الف سمجھائی
'بلھیا' قول الف دے پورے جیہڑے دل دی کرن صفائی!

یعنی اک الف کو پڑھ لو چھٹکارا مل جائے گا- 'الف' حروف تہجی کا پہلا حرف ہے- صوفیاء کرام 'الف' کو واحد، ذات متعلق، یکتا کی علامت کے طور پہ دیکھتے ہیں- ان کے نزدیک 'الف' حروف و الفاظ کی ابتدا ہے- اسے سمجھے اور جانے بغیر آپ علم کا سفر نہیں کر سکتے- 'الف' کا وجود یکتا ہے- وہ واحد ہے، اول سے آخر تک اور آخر سے اول تک 'الف' ہی رہنا ہے- صوفی 'الف' کی تحریری ساخت کو ذات باری تعالیٰ کے تصور سے جوڑتے ہیں- جس طرح وہ اپنی ذات میں یکتا ہے اسی طرح 'الف' کی شکل تبدیل نہیں ہوتی- سالک کو بھی 'الف' کی طرح یکتا بننا ہے- وہ اپنی ذات میں مکمل ہو- اپنے قول و فعل میں کامل ہو- وہ نیک عمل کا مالک ہو-

اخلاقیات فلسفہ کا اہم شعبہ ہے- تمام صوفیاء کرام، ولی اللہ نے عمل کے ساتھ اس کی تلقین کی ہے- ایک کامل انسان کا تصور اخلاقیات کے سواء ممکن نہیں- احترام انسان کے بغیر معاشرتی ترقی کا حصول ممکن نہیں- سماجی و مذہبی رواداری، سچائی، عدل، انصاف، معاشرتی شعبوں میں خاص اہمیت کے حامل ہیں جن پر عمل کے بغیر نہ تو کوئی معاشرہ ترقی کر سکتا ہے اور نہ ہی دھرتی پہ امن قائم کیا جا سکتا ہے- ان چیزوں کے حصول کے لئے انسان کے اخلاق کا اعلیٰ ہونا سب سے اہم ہے- انسان کائنات کے تخلیق کار کی سب سے معتبر اور ارفع تخلیق ہے- جس کا رتبہ کائنات کی تمام تر مخلوقات میں معتبر ہے- وہ رتبہ اس کو دانائی، حکمت اور عقل کی بنیاد پہ عطا کیا گیا ہے- حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) کے نزدیک عشق کے سوا کچھ

بھی حاصل کرنا ممکن نہیں- آپؒ کے نزدیک انسان کو جو کچھ بھی عطا ہوتا ہے وہ عشق ہی کی بدولت ہے- جیسا کہ آپؒ فرماتے ہیں:

جیں دل عشق خرید نہ کیتا سو دل درد نہ پھٹی ھُو
اس دل تھیں سنگ پتھر چنگے جو دل غفلت اٹی ھُو
جیں دل عشق حضور نہ منگیا سو درگاہوں سُٹی ھُو
ملیا دوست نہ انہاں باھُوؒ جنہاں چوڑ نہ کیتی تڑٹی ھُو

جو عشق خرید نہیں کرسکتے وہ در در کی ٹھوکر کھاتے ہیں- وہ بڑے بد نصیب ہوتے ہیں- وہ علم و عرفان تک نہیں پہنچ سکتے، وہ مقام عرفیت سے دور ہو جاتے ہیں- وہ عام کی نظر میں پڑھے لکھے جانے جاتے ہیں- مگر وہ عالم فاضل نہیں بن پاتے- ان کے خیالات سے تازگی کا احساس پیدا نہیں ہوتا- ان میں وہ مہک نہیں ہوتی جس پہ لوگ کھینچ کر آتے ہیں- وہ تو اندر سے خالی ہوتے ہیں- اتنے خالی کے ان کو اپنے آپ سے بھی ڈر لگتا ہے- وہ تنہائی سے ڈرتے ہیں- وہ لوگوں سے ڈرتے ہیں- وہ آنے والی تبدیلی سے ڈرتے ہیں- وہ خود سے ہی ڈرتے ہیں- ایسے شخص کسی بھی طرح معاشرتی ترقی کے لئے فائدہ مند نہیں ہوتے- حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں:

جیں دل عشق خرید نہ کیتا سوئی خسرے مرد زنانے ھُو
خنسے خسرے ہر کوئی آکھے کون آکھے مردانے ھُو
گلیاں دے وچ پھرن اَربیلے جیوں جنگل ڈھور دیوانے ھُو
مرداں تے نمرداں دی گل تداں پوسی باھُوؒ جداں عاشق بنہسن گانے ھُو

آپؒ فرماتے ہیں کہ جس نے بھی عشق کا سبق پڑھنا ہے وہ کسی صاحب عشق کے حضور حاضر ہو، کیونکہ صاحب عشق ہی صاحب ولایت ہے- صاحبِ ولایت ہی کامل انسان ہے- ان کا رتبہ کائنات میں ممتاز بن جانے کے بعد وہ اسی منصب پہ فائز ہے جو اب خلقِ خدا کے لئے راہ ہدایت کا وسیلہ ہے-

مزید آپؒ فرماتے ہیں:

رات اندھیری کالی دے وچ عشق چراغ جلاندا ھُو
جیندی سِک توں دل چانیوے توڑیں نہیں آواز سناندا ھُو
اوجھڑ جھل تے مارو بیلے اِتھے دم دم خوف شیہاں دا ھُو
تھل جل جنگل گئے جھگیندے باھُوؒ کامل نینہہ جنہاندا ھُو

حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) کے ہم عصر سندھی کلاسیکل شاعر حضرت شاہ عنایت رضوی (1620ء-1708ء) لکھتے ہیں:

كامي كوري وچ ۾، پتنگ ويا پچي
اُني وٽ آتش جي، سيڪا سُڏ سچي
موٽئو ڪو نہ بچي، ڪامي سڀ خاڪ ڪيا

”وہ آگ میں جل کر بھسم (مکمل) ہوگئے، (کیونکہ) وہ آگ میں جلنے کی سچی خواہش رکھتے ہیں- وہ لوٹ کر نہیں آتے، وہ جل کر خاک (فنا) ہو جاتے ہیں“-

افتخار قطب اپنی کتاب ”مجروح افکار“ میں لکھتے ہیں کہ:

”انسانی زندگی میں تحرک / حرکت خوف کے بدولت ہے- خوف ہی انسان کو اپنی شخصیت کی پہچان بھی کراتا ہے اور اس کو سنوارتا بھی ہے“-

یعنی انسان کی پوری تگ و دو خوف پہ قائم ہے- صوفی بنیادی طور پہ اس دنیا میں آنے کا سبب معلوم کرتا ہے- کائنات میں اس کی حیثیت اور کارج کے متعلق جانتا ہے- وہ اس بنیادی سوال کے جواب میں سفر کرتا ہے- جس کے نتیجے میں اسے پہ عجیب و غریب باتیں عیاں ہوتیں ہیں- وہ اس سفر میں بہت سے انکشافات سے واقف ہوتا ہے- وہ مختلف کیفیات سے گزر کر اس نتیجے پہ پہنچتا ہے کہ وہ جس سوال کو جواب باہر تلاش کر رہا ہے وہ اس کے اندر ہی پوشیدہ ہے- جیسا کہ حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں:

ایہہ تن رب سچے دا حجرا وچ پا فقیرا جھاتی ھو،
ناں کر منت خواج خضر دی تیرے اندر آب حیاتی ھو،
شوق دا دیوا بال ہنیرے متاں لبھے وست کھڑاتی ھو
مرن تھیں اگے مر رہے باھوؒ جنہاں حق دی رمز پچھاتی ھو

یہ راز سالک پہ تب عیاں ہوتا ہے جب وہ خود کو عشق کی آگ میں جلاتا ہے جب وہ اس آگ میں جل کر ختم ہوتا ہے تب ہی وہ اصلیت / حقیقت کو پہچانتا ہے جو اسے مٹی سے کندن بنادیتا ہے- یہ عشق کی آگ اور اس کے دیوانے پتنگ بھی عجب ہوتے ہیں- ان کی دیوانگی ان کیلئے خوف کی حالت پیدا کرتی ہے اور جب اس خوف کی حالت سے باہر نکلتے ہیں تو بے خوف و خطر اپنے اندر اتر کر کائنات کی وسعت کو پالیتے ہیں-

حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) کے پنجابی ابیات میں جو مضامین کثرت سے پائے جاتے ہیں ان کا مرکزی نقطہ انسانی اصلاحات ہے وہ انسان کو گمراہی، غفلت، برائی سے بچنے اور صراط مستقیم پہ چلنے کی تلقین کرتے ہیں- وہ عشق (سپردگی) کی حالت میں خود کو ڈھالنے کی ترغیب دیتے ہیں- وہ اسی راہِ عشق پہ چلنے کیلئے مرشد یعنی صاحبِ عشق (کامل انسان) کی صحبت اختیار کرنے کے لئے کہتے ہیں- یہ دنیا انسان کے اپنے عمل کے نتیجے میں گل و گلزار بھی بن سکتی ہے تو وہ ہی دنیا پلیتی بن کر انسان کو رسوا و خوار بھی کر سکتی ہے- حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) "کامل انسان" کا تصور پیش کرتے ہیں جو معاشرتی ترقی کا وسیلہ بن سکے- آپؒ فرماتے ہیں:

سبق صفاتی سوئی پڑھدے جو وت ہیٹی ذاتی ہو
علموں علم انہاں نوں ہویا جیڑے اصلی تے اثباتی ھو
نال محبت نفس کٹھونے کڈھ قضا دی کاتی ھُو
بہرہ خاص انہاں نوں باھُو جنہاں لدھا آب حیاتی ھُو

☆☆☆

ماخذ:

- افتخار قطب، مجروح افکار، مارچ 1998ء-
- جی-آر-پوری-ٹی-آر شنگاری، سائیں بلھے شاہ، فکشن ہاؤس لاہور، 1999ء-
- حضرت سلطان باھو، شمس العارفین، سید امیر خان نیازی (مترجم)، العارفین پبلیکیشنز لاہور، 2002ء-
- ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ، میین شاہ عنات جو کلام، سندھی ادبی بورڈ، 1963ء-
- ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ، قاضی قادن جو رسالو، انسٹیٹیوٹ آف سندھالوجی، 1999ء-
- عثمان علی انصاری (مرتب)، رسالو سچل سرمست، ایڈٹ: ڈاکٹر مخمور بخاری، سندھی ادبی بورڈ، 2012ء-
- کلیان آڈوانی (مرتب)، شاہ جو رسالو، محکمہ ثقافت حکومت سندھ 2012ء-
- Dr.Z. A.Awan, Heart Deeper Than Ocean, Al-Arifeen Publications Lhore,2017.

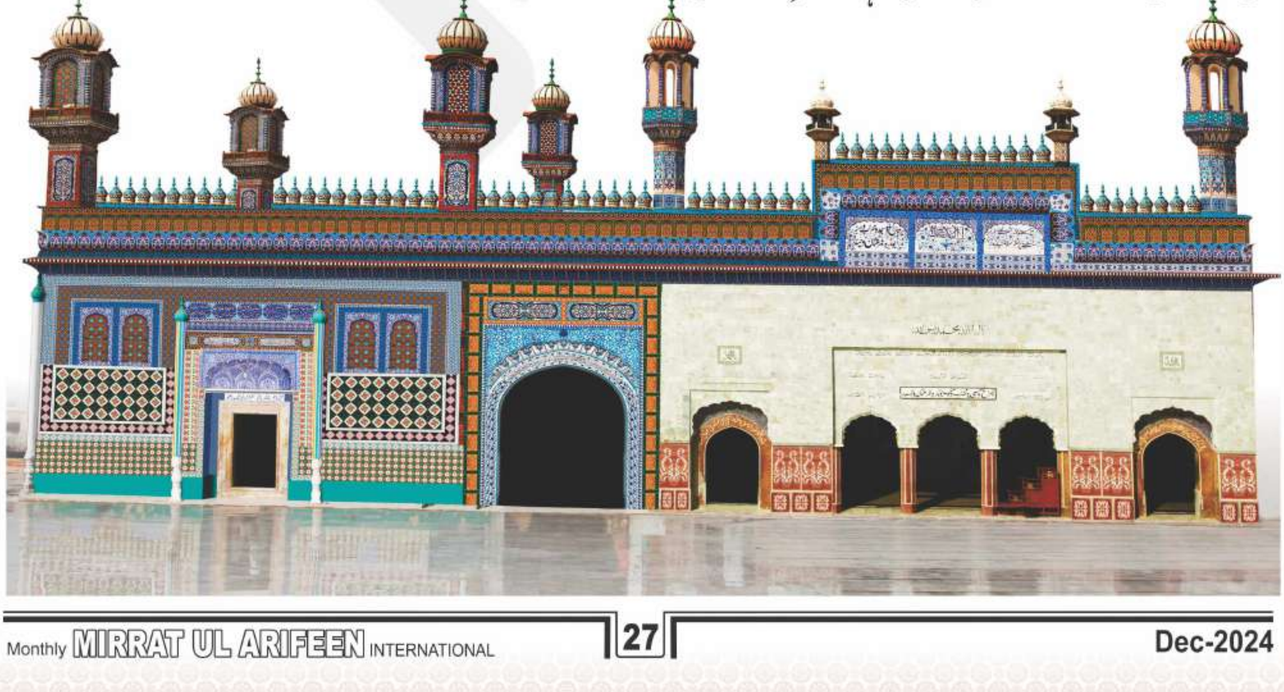

مولانا جلال الدین رومی اور حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ)

انسانیت کیلئے امن اور محبت کی معتبر نوید

ڈاکٹر نجیب حید رملغانی
سابق رجسٹرار، غازی یونیورسٹی، ڈیرہ غازی خان

انسانی معاشرے کی ہئیتی اور نظریاتی تشکیل کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مختلف عوامل انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے رہے جن سے معاشرے کی ہئیتی اور نظریاتی ترکیب وترتیب بدلتی رہیں ان عوامل میں سے جو نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں ان میں اہم ترین عمل اغراض وبقا کی قوتوں کا تصادم اور ارتقا ہے جس سے فرد کا فرد سے اور معاشرتی معروض سے تعلق بنتا اور بدلتا رہا- صدیوں کے اس سفر میں انسان کا اقتصادی معاشرتی اور جذباتی استحصال اپنی پوری شدت کے ساتھ ہوتا رہا جبر واستبداد کی ان استحصالی قوتوں کے خلاف انفرادی اور اجتماعی مزاحمتی جد و جہد بھی اپنے فکری ارتقا کے ساتھ مصروف عمل رہی- یہ فکری ارتقا افقی اور عمودی سمتوں میں آگے بڑھتا رہا- فکری ارتقا کی عمودی نمو کے لئے خیر کی قوتیں انسانی تاریخ کے اولین باب سے مصروف عمل رہیں- یہ خیر کی قوتیں مختلف مذاہب معاشرتی فلسفوں اور نظریوں کی صورت میں ظاہر ہوتی رہیں جن سے فرد کے فرد سے اور معاشرتی معروض سے ربط اور بذات خود معاشرے کی کئی جہتوں کی تشریح اور ترویج ممکن ہوئی- آج اکیسویں صدی میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی انسان کے نامیاتی وجود کو غیر نامیاتی وجود میں بدلنے کی بات کر رہی ہے- مختلف سیاسی اور سماجی نظام بھی فرد کے مادی وجود کو اہمیت دیتے رہے صدیوں کے اس سفر میں ایک فکر اس بات پر زور دیتی رہی کہ فرد مادی وجود کے ساتھ ساتھ اپنی ایک روحانی شناخت رکھتا ہے جس کی بالیدگی کے بغیر حصول مسرت ممکن نہیں- روحانی مسرت اس لافانی محبت کا نام ہے جو رنگ و نسل اور جغرافیائی سرحدوں سے ماوراء ہوتی ہے یہاں تک کہ یہ محبت کسی نظریاتی یا مذہبی فکر کے تابع نہیں ہوتی-

کولمین بارکس (Coleman Barks) اپنی کتاب "The Essential Rumi" کے تعارف میں لکھتے ہیں کہ مولانا رومی نے تمام مذاہب کی حدود کو تحلیل کر کے عالمی محبت کی سلطنت میں ضم کر دیا ہے اور ابھرتی مٹتی لہروں کی کثرت کو سمندر کی یکتائی کا روپ دیا ہے- علم والہام کی دھرتی برصغیر پاک و ہند کے عظیم صوفی شاعر حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) نے اس پیغام کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ الہامی مذاہب کی تکریم کے ساتھ ساتھ مقامی ثقافت یا مقامیت کی تکریم وترویج بھی بہت ضروری ہے کیونکہ وجود کا خمیر دھرتی سے جڑا ہوتا ہے اور کائناتی شعور کا منبع فطرت اور دھرتی کی نرم مٹی سے نمو پاتا ہے-

مولانا رومی (رحمۃ اللہ علیہ) کائناتی شعور یا روحانی بالیدگی کے سفر میں عشق کو اپنا امام مانتے ہیں:

شاد باش اے عشق سودائے ما
ای طبیب جمله علت ہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما
اے تو افلاطون و جالینوس ما

”اے ہمارے اچھے جنون والے عشق، شاد رہ آباد رہ کہ تُو ہی ہماری تمام علّتوں اور بیماریوں کا طبیب ہے- اے عشق تُو ہی ہماری نخوت و تکبر اور نام وناموس طلبی کی دوا ہے، اے عشق تُو ہی ہمارا افلاطون ہے، تو ہی ہمارا جالینوس ہے“-

حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں:

اِک نگاہ جے عَاشق ویکھے لکھ ہَزاراں تارے ھو
اِک نگاہ جے عَالم ویکھے کِسے نہ کدھی چَاہڑے ھو

عشق وہ پُر جوش جذبہ ہے جس کا اظہار و ادراک شاعری اور موسیقی کی زبان میں پر زور انداز میں ممکن ہے- اس لئے صوفیاء نے ابلاغ کیلئے خاص ترکیبات و تشبیہات تخلیق کی ہیں جن سے پرت در پرت کائنات کے سربستہ راز کھلتے چلے جاتے ہیں- اس الہامی فکر میں عالم موجودات وجود مطلق کا مظہر ہوتا ہے جہاں سے لافانی محبت کے چشمے پھوٹتے ہیں اور عالم موجودات مطلق یکتائی کے روپ میں جلوہ گر ہوتا ہے-

مولانا رومی اور حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہما) کی شاعری میں یہ فکر نمایاں ہو کے سامنے آتی ہے- حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں:

ازل ابد نُوں صحی کیتوسے ویکھ تماشے گُزرے ھو
چوداں طَبق دِلیںڈے اَندر آتش لائے حُجرے ھو
جِنہاں حَقّ نہ حاصل کیتا اوہ دوہیں جہانیں اُجڑے ھو
عَاشق غَرق ہوئے وِچ وحدت باھُوؒ ویکھ تِنہاندے مُجرے ھو

تاریخ بتاتی ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی اناطولیہ کیلئے کرب و آلام کا عہد تھا- مغرب سے صلیبی جنگوں کی بربریت خطے کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی- بازنطینی سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا، دوسری طرف چنگیز خان کی سربراہی میں منگول وحشی دنیا کے امن کو تباہ کر رہے تھے-1244ء کے اس منظر نامے میں شمس تبریز کی ایک نظر مولانا کے ظاہری اور دنیاوی جاہ و جلال کو دمان کی واچھڑ کی طرح بہا کر لے گئی اور مولانا کے اندر سے لازوال محبت کے چشمے پھوٹ پڑے اور وہ محبت، رنگ، نسل، عقائد و جغرافیائی سرحدوں کی قید سے ماورا ہو کر روح کے تال پر رقص کناں ہوئے- دوسری طرف سترویں صدی کے عظیم صوفی شاعر حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) کا عہد سیاسی و انتظامی طور پر قدرے مستحکم تھا- گو اس وقت کا ہندوستان مغلوں کے زیر تسلط تھا- ہمارے زیر بحث صوفیاء نے عشق کو ایک لازوال اور متحرک قوت کے طور پر برتا- مولانا رومؒ کی بانسری اور حضرت سلطان باھوؒ کی ”ھو“ کی سُر میں ایک ہی پیغام سامنے آیا کہ اس کرۂ ارض پر انسانی مسرت کا راز صرف اور صرف محبت میں پوشیدہ ہے اور ان کے نزدیک عشق کی قوت سے ہی زمان و مکان اور رنگ و نسل کی سرحدوں کے پار، فرد جلوہ حقیقت سے روشناس ہوتا ہے جہاں عاشق و محبوب اور طالب و مطلوب کی تفریق ختم ہو جاتی ہے- گو کہ عالم موجودات اور وجود مطلق ربط کی وضاحت صدیوں سے زیر بحث رہی ہے، کچھ مغربی مفکرین مثلاً سینٹ آگسٹائن اور سینٹ تھامس ایکویناس کے نزدیک خدا کے وجود کا تصور وقت کی حدود کے تصور سے ماوراہے اور یہ تصور وقت کے لافانی اور ابدی ہونے کے تصور کے بھی برعکس ہے- اسلامی تصوف میں بھی یہ مسئلہ بہت زیر بحث رہا جس کے نتیجے میں دو نکتہ ہائے نظر سامنے آئے جنہیں ہم وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے نام سے جانتے ہیں اور دونوں فکری نظریوں نے اپنے اپنے طور پر عالم موجودات اور ذات مطلق کے ربط کی خوبصورت انداز میں وضاحت کی ہے اور کچھ صوفی شعرا کو کسی ایک فکری تحریک سے وابستہ کرنا کسی حد تک آسان بھی لگتا ہے مگر مولانا رومیؒ اور حضرت سلطان باھوؒ کی شاعری کو کسی ایک تحریک کے زیر اثر دیکھنا خاصا مشکل ہے- کسی حد تک دونوں نکتہ ہائے نظر کی تطبیق نظر آتی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ یہ دونوں صوفی شاعر عشق کی بے عمیق وسعتوں میں عالم موجودات اور وجود مطلق کے ربط کو دیکھتے ہیں- ان کے نزدیک عشق اور مرشد امکان سے لا امکان کے سفر کی تفہیم ہیں-

حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں:

جِس مَنزل نوں عِشق پُچاوے اِیمان نوں خَبر نہ کوئی ھو

مولانا رومیؒ اور حضرت سلطان باھوؒ کے نزدیک مرشد کامل کی ایک نظر ہی عرفان ذات عطا کرتی ہے جس سے فرد خود پہ منکشف ہوتا ہے اور عالم موجودات کے ہر مظہر سے وہ وابستگی پیدا ہوتی ہے جس سے دشت امکانات رنگ و خوشبو سے بھر جاتا ہے- حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں:

الف: اللہ چنبے دی بوٹی میرے من وچ مرشد لائی ھو
نفی اثبات دا پانی ملیس ہر رگے ہر جائی ھو
اندر بوٹی مشک مچایا جاں پھلاں تے آئی ھو
جیوے مرشد کامل باھو جیں ایہ بوٹی لائی ھو

مولانا روم (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں:

دید آں مرشد کہ او ادراک داشت
تخم پاک اندر زمین پاک کاشت

"مرشد نے دیکھا کہ استعداد رکھتا ہے تو پاک دل کی زمین میں پاک بیج بو دیا"۔

ہمارے دونوں صوفی شاعروں کی فکر کے مطابق درد و فراق کی شدت منزل وصل کو قریب لاتی ہے۔ راہ عشق میں ریزہ ریزہ وجود نشان منزل بنتا ہے۔ بزبانِ مولانا رومیؒ:

سینہ خواہم شرح شرح از فراق
تا بگویم شرح درد اشتیاق

"میں ایسا سینہ چاہتا ہوں جو جدائی سے پارہ پارہ ہو تا کہ میں درد عشق کی تفصیل سنا سکوں"۔

حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں:

تن مَن میرا پُرزے پُرزے جیوں درزی دیاں لیراں ھو
اینہاں لیراں دی گل کفنی پا کے رَلساں سنگ فقیراں ھو

یہ عشق کا وہ مقام ہے جو دشت کربلا میں حسین ابن علی (رضی اللہ عنہما) کی وہ آبرو مندانہ استقامت بنتا ہے جس کے آگے جبر و استبداد کی قوتیں رہتی دنیا تک سرنگوں رہیں گی۔ جیسا کہ حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں:

سچا عشق حسین علی دا باھوؒ سر دیوے راز نہ بھنے ھُو

سامراجی نظام تعلیم میں صوفی کو تارک دنیا اور دنیاوی علوم کے مخالف کے روپ میں ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ صوفی دراصل ہر اس علم کے خلاف ہے جو کسی دوسرے فرد یا قوم پر برتری کیلئے حاصل کیا جائے۔ مولانا رومی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں:

علم را بر تن زنی ماری بود
علم را بر دل زنی یاری بود

"علم کا ربط اگر بدن سے ہو تو سانپ ہے اگر علم کا رشتہ دل سے ہو تو یار ہے"۔

حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں:

جاگ بناں دودھ جمدے ناہیں بھانویں لال ہون کڑھ کڑھ کے ھو

یہاں جاگ عمل کے استعارے کے طور پر برتا گیا ہے یعنی عمل کے بغیر علم کبھی بھی مقصد کے حصول کا وسیلہ نہیں بن سکتا۔

حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) کی شاعری میں عشق کی وہ رمز پوشیدہ ہے جو اہل دل پر علم موجودات اور وجود مطلق کے ربط کے ایسے اسرار منکشف کرتی ہے جو زمان و مکان کی حدود سے ماوراہیں۔ انسانی شعور جو زمان و مکان کی قید سے باہر دیکھنے کی اہلیت نہیں رکھتا عشق کی لامحدود طاقت لامکاں کو امکان کے منظر نامے میں جلوہ گر کرتی ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں:

کُن فَیَکُونُ جدوں فرمایا اساں بھی کولوں ہاسے ھو
ہکے ذات صفات ربے دی آہی ہکے جگ ڈھنڈیاسے ھو
ہک لا مکان مکان اساڈا ہکے آن بتاں وچ پھاسے ھو

عشق کی ابدیت حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) کو لا امکان کے منظر دکھاتی ہے اور رسومات و ریاکاری پہ مبنی رسمی عبادات کی نفی کرتے ہیں اور اس نفی کیلئے آپ نئی ترکیبات تخلیق کرتے ہیں۔

ناں مَیں بھج مسیتیں وڑیا ناں تسبا کھڑ کایا ھو

ابدیت کی اہم صفت غفلت سے ماوراہونا ہے۔

جو دم غافل سو دم کافر سانوں مرشد ایہہ پڑھایا ھو

حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) نہ صرف اس صفت سے آشنا ہیں بلکہ غفلت کے پل کو کفر کا درجہ دیتے ہیں اس کی ساتھ ساتھ وہ کائنات کی لامتناہی وسعتوں کو فرد کی ذات کے اندر بھی دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک فرد کی ذات عمیق گہرا راز ہے اور کائنات کے سربستہ رازوں میں سے ایک ہے جس نے دل کے راز کو پالیا اس نے ذات مطلق کو پالیا۔ جیسا کہ آپؒ فرماتے ہیں:

دِل دریا سمندروں ڈُوگھے کون دِلاں دیاں جانی ھو
وِچے بیڑے وِچے جھیڑے وِچے ونجھ مُوہانی ھو
چوداں طبق دِلے دے اندر جتھے عِشق تنبو وَنج تانی ھو
جو دِل دا محرم ہووے باھوؒ سوئی رَبّ پچھانی ھو

☆☆☆

اَبیاتِ باھُو رحمۃ اللہ علیہ

ایک توضیحی مطالعہ

ڈاکٹر طالب حسین سیال

سلطان العارفین حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) سترہویں صدی عیسوی کے ایک مقبول اور مشہور صوفی ہیں- آپ (رحمۃ اللہ علیہ) اپنے پنجابی ابیات کی وجہ سے عارفانہ شاعری میں ایک منفرد اور ممتاز مقام رکھتے ہیں- ان کے ابیات خواص و عوام میں یکساں مقبول ہیں- آپؒ کی تصانیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فارسی اور عربی زبان میں قابلِ قدر استعداد رکھتے تھے- علمِ باطنی میں بھی آپؒ (رحمۃ اللہ علیہ) بامِ عروج پر فائز تھے اس علمِ باطن کو علمِ لدنی بھی کہا جاتا ہے-

اگرچہ آپ (رحمۃ اللہ علیہ) سالکین کے لیے عرفان و معرفت کا خصوصی علم رکھتے تھے اور فرماتے تھے ”طاب بیا، طالب بیا“ (طالب آجا، طالب آجا) لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے عام دیہاتی اور دہقانی عوام کو بھی اپنے فیضانِ عرفان سے محروم نہیں رکھا—پنجابی ابیات میں ان کو تزکیہ نفس، دل کی صفائی، حسنِ نیت اور اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیبِ مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عشق و محبت کی تعلیم دی اور اپنے زورِ بیان سے ان کے قلب و جگر کو مسخّر کرلیا-

آپؒ نفسِ امّارہ کی ترغیبات سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں، نفسِ امارہ سے مغلوب ہونے کی بجائے اس پر سواری کی ترغیب دیتے ہیں کیونکہ بڑے بڑے عالم نفسانی خواہشات کے اسیر ہو جاتے ہیں- آپؒ مزید فرماتے ہیں کہ فقر کا مقام پانا کافی مشکل ہے- ان کا اس موضوع پر جھنگ، شورکوٹ اور دریائے راوی کے کنارے بسنے والی لوگوں کی زبان میں یہ بیت ملاحظہ کریں:

> ایہوں نفس اساڈا بیلی جو نال اساڈے سِدّھا ھو
> زاہد عالم آن نوائے جتھے ٹکڑا ویکھے تھِدّھا ھو
> جو کوئی اس دی کرے سواری اس نام اللہ دا لدّھا ھو
> راہ فقر دا مشکل باھوؒ گھر ما نہ سیرا رِدّھا ھو

یہی ہمارا نفس ہے جو ہمارا دوست ہے اور اس کی دوستی آہستہ آہستہ پکی ہو جاتی ہے-اس نفس نے زاہدوں اور عالموں کو بھی جھکا دیا ہے یہاں تک وہ جہاں روٹی کا کوئی ٹکڑا گھی سے چپڑا ہوا (یعنی مال و دولت) دیکھتے ہیں وہ اس طرف مائل ہو جاتے ہیں- جو نفس پر سواری کے قابل ہو جائے وہ اللہ کے اسم کو ڈھونڈ لیتا ہے- فقر کا راستہ کافی مشکل ہے- یہ نہ سمجھو کہ یہ اس طرح آسان اور مزیدار ہے جس طرح گھر میں ماں نے حلوہ بنایا ہو-

حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) خلوص اور فقر کو اصلِ تصوف قرار دیتے ہیں اور یہ مقام ریاضت اور مرشد کی رہنمائی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا- جیسا کہ آپؒ فرماتے ہیں:

> اَللہ پَڑھیوں پڑھ حافظ ہویوں ناں گِیا حِجابوں پردا ھو
> پَڑھ پَڑھ عَالِم فَاضِل ہویوں بھی طَالِب ہویوں زَر دَا ھو
> سَئیے ہَزار کِتاباں پَڑھیاں پَر ظَالم نَفس نہ مَردا ھو
> باجھ فَقِیراں کِسے نہ مَاریا باھوؒ ایہو ظالم چور اَندر دَا ھو

اللہ اللہ کا ورد کرتے کرتے آپ حافظ ہو جاتے ہیں لیکن باطن پر پردہ پڑا رہتا ہے (وہ پردہ خلوص کے بغیر نہیں ہٹتا)- تم بے شک کتابیں پڑھ پڑھ کر عالم اور فاضل کہلاتے ہو لیکن تم مال و دولت کے طلبگار ہوئے- بے شک ہزاروں کتابیں پڑھ لی جائیں لیکن ظالم نفس اس سے نہیں مرتا- فقیر (مرشد کامل) کے بغیر یہ نفس جو اندر کا چور ہے کبھی نہیں مرتا-

ہر زمانے میں علمائے حق کے ساتھ ساتھ علمائے سوء بھی رہے ہیں- حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) کے زمانے میں بھی ریاکار، طالبِ دنیا اور متکبر عالم تھے- وہ فرماتے ہیں:

> پڑھ پڑھ عالم کرن تکبر حافظ کرن وڈیائی ھو
> گلیاں دے وچ پھرن نمانے وتن کتاباں چائی ھو
> جتھے ویکھن چنگا چوکھا اوتھے پڑھن کلام سوائی ھو
> دوہیں جہانیں سوئی مٹھے باھوؒ جنہاں کھادھی ویچ کمائی ھو

عالم اپنی پڑھائی اور تعلیم پر تکبر کرتے ہیں جبکہ قرآن مجید کے حافظ اپنی بڑائی پر اتراتے ہیں- ایسے عالم اور حافظ بے کس گلیوں میں پھرتے رہتے ہیں اور کتابوں کو اٹھائے پھرتے

ہیں- جہاں ان کو وافر کھانا یا مال و زر نظر آئے وہاں وہ نہایت شوق اور سُر کے ساتھ کلام پڑھتے ہیں- اے باہو! یہ عالم اور حافظ دونوں جہانوں میں تباہ و برباد ہو گئے کیونکہ انہوں نے دین کو بیچا اور اپنی کمائی ہوئی نیکیوں کو بیچ کر کھا گئے-

تصوف کا اصل مقصد دل کو غیر اللہ سے خالی کر کے اللہ تعالیٰ کی محبت کو دل میں بسانا ہے اور مقصود آدھی رات کی عبادت و ریاضت اور اپنے اندر کے اصل انسان کو جگائے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا- پھر آپؒ فرماتے ہیں:

ایہہ تن رب سچے دا حجرا وچ پا فقیرا جھاتی ھو
ناں کر منت خواج خضر دی تیرے اندر آب حیاتی ھو
شوق دا دیوا بال ہنیرے متاں لبھی وست کھڑاتی ھو
مرن تھیں اگے مر رہے باھُوؒ جنہاں حق دی رمز پچھاتی ھو

یہ تن سچے رب کا حُجرا (مکاں) ہے (انسان کے باطن میں رب رہتا ہے)- اے فقیر! اس کے اندر جھانک -خواجہ خضر (علیہ السلام) کی منت نہ کر، تیرے اندر ہی آبِ حیات ہے- اندھیرے میں شوق کا چراغ روشن کر، ممکن ہے تجھے گمشدہ خزانہ (کنزِ مخفی) مل جائے اور تیری دست گیری ہو جائے- جن سائلوں نے حق کا راز پہچان لیا وہ مرنے سے پہلے مر چکے-

قرآن حکیم نے تزکیہ نفس اور قلب کی صفائی پر یوں زور دیا ہے:

”فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ“[1]

”تو یہ کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں میں ہیں“-

صوفیاء کرام کے نزدیک قلب تب جاری ہوتا ہے جب عشقِ الٰہی میں بندہ اپنے آپ کو رنگ لے- دل کی دنیا بہت وسیع اور گہری ہے- اس میں ہی خواہش پیدا ہوتی ہے، اُمنگیں ابھرتی ہیں اور کئی خواہشیں دم توڑ جاتی ہیں- محبت دل میں ہی پیدا ہوتی اور پروان چڑھتی ہے- محبت کے جھگڑے اور جھیڑے ختم نہیں ہوتے، دل میں عشق کا تلاطم دریا کے تلاتم کی طرح جاری رہتا ہے اور اس میں سمندر کی طرح مد و جزر ہوتا رہتا ہے- حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں:

دِل دریا سمندروں ڈُوگھے کون دِلاں دیاں جانے ھو
وِچے بیڑے وِچے جھیڑے وِچے ونجھ مُوہانے ھو
چوداں طَبق دِلے دے اَندر جتھے عِشق تنبُو وَنج تانے ھو
جو دِل دا محرم ہووے باھوؒ سوئی رَبّ پچھانے ھو

دل دریا ہے جو سمندر سے بھی گہرا ہے- دل کے بھید کون جان سکتا ہے، اسی دل میں کشتیاں ہیں، اسی میں ملاح ہیں اور اسی میں محبت کے قصے اور محبت کے جھگڑے ہیں- دل کے اندر ہی چودہ طبق ہیں جہاں عشق نے جا کر خیمے گاڑھے ہیں- جو دل کا محرم ہو وہی رب کو پہچان سکتا ہے-

سلوک کے مقامات طے کرنے اور منازل کے حصول کے لیے مرشد کی ہدایت اور نگرانی ضروری ہے - حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) کے دو ابیات اس بارے میں ملاحظہ کیجئے!

اَلِف اَللہ چَنبے دِی بُوٹی میرے مَن وِچ مُرشد لائی ھو
نَفی اَثبات دَا پَانی مِلیس ہَر رَگے ہَر جَائی ھو
اَندر بُوٹی مُشک مَچایا جَاں پھُلّاں تے آئی ھو
جیوے مُرشِد کامِل باھوؒ جَیں ایہ بُوٹی لائی ھو

☆☆☆☆☆

تَسبی پھِری تے دِل نہیں پھِریا کی لیناں تسبی پھڑ کے ھو
عِلم پڑھیا تے اَدب نہ سِکھیا کی لیناں عِلم نوں پڑھ کے ھو
چِلّے کَٹّے تے کُجھ نہ کھٹیا کی لیناں چِلّیاں وَڑ کے ھو
جاگ بنا دُدھ جمدے ناہیں باھوؒ بھانویں لال ہونون کڑھ کڑھ کے ھو

تسبیح کے دانے پھیرنے سے اگر دل نہیں بدلتا تو پھر تسبیح پکڑنے کا کیا فائدہ؟ علم حاصل کر لیا جائے ادب (مرشد اور بڑوں کا) نہ سیکھا جائے تو علم حاصل کرنا لاحاصل ہے (اس کا کیا مقصد ہے؟)- 40 روز تک کسی جگہ مراقبہ کیا جائے لیکن انوار و تجلیاتِ الٰہی کا مشاہدہ نہ کیا جائے تو ایسے چلوں کی دنیا میں جانے سے کیا حاصل ہوتا ہے؟ جاگ کے بغیر (دودھ میں تھوڑی سی دہی ملانا) دودھ کبھی نہیں جمتا یعنی اس قابل نہیں ہوتا کہ اس سے مکھن بنا لیا جائے- لہٰذا! چاہے دودھ کو اتنا گرم کر دیں کہ وہ پک پک کر لال ہو جائے لیکن وہ دہی نہیں بن سکے گا اسی طرح مرشد کامل کی توجہ کے بغیر عرفانِ حق نصیب نہیں ہوتا-

☆☆☆

[1] (الحج:46)

اخلاقی رویّے اور صوفی ازم

نعیم فاطمہ علوی

محبت، الفت، عشق، برداشت، انکساری، رواداری اور تحمل، اگر بازار میں بکتے تو خرید کر شخصیت کا حصہ بنا لیے جاتے اور پھر قوموں کی تشکیل بھی آسان ہو جاتی - بحالی امن کے لیئے بھی اطمینان ہوتا - بقول غالب:

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا

مگر ایسا نہیں - کائنات میں اگر کچھ محیر العقول شے ہے، تو وہ انسان ہے - آپ کے سامنے چلنے پھرنے گفتگو کرنے والا انسان ایک تو وہ ہے جو آپ کو نظر آتا ہے اور دوسرا وہ جو آپ کے اندر آپ کا ہمزاد ہے -

ظاہری انسان کی ساری زندگی باطنی انسان کو سمجھانے، سدھارنے اور اس کی نشو و نما کرنے میں بسر ہوتی ہے - یہ اضطرابی عمل تاحیات جاری و ساری رہتا ہے -

ہمارے صوفیاء کرام نے فکر و تدبر کی روشنی سے جانا کہ انسان کو اپنے منفی رویوں کو مثبت رویئوں میں بدلنا ہے، کیونکہ وہ اس دنیا کو بدصورت نہیں، خوبصورت بنانے کے لئے آیا ہے - دنیا کی خوبصورتی انسانیت کی بھلائی اور خدمت میں ہے - جیسا کہ بابا بلھے شاہ (رحمۃ اللہ علیہ) نے بھی کہا:

مسجد ڈھا دے مندر ڈھا دے ڈھادے جو کجھ ڈھیندا
اک بندے دا دل نہ ڈھاویں رب دلاں وچ رہندا

جب انسان کے اندر انسانیت کا درد اور محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اشرف المخلوقات کے منصب پر فائز ہونے کا اہل ہو جاتا ہے -

ہمارے صوفیاء کرام کا بنیادی مقصد اسی نکتہ نظر کی تبلیغ ہے - اگرچہ مولانا رومیؒ اور حضرت سلطان باھوؒ کے ادوار میں چار صدیوں سے زائد کا فرق ہے لیکن دونوں صوفیاء میں گہری فکری مماثلت ہے - ان صوفیاء نے اپنے دائرہ محبت سے کسی کو دور نہیں کیا - فتوے نہیں لگائے - تضادات کو سامنے رکھتے ہوئے سب کو ساتھ ملایا - ان کی تعلیمات میں کسی قسم کا نسلی و علاقائی تاثر نظر نہیں آتا - حالانکہ دیکھا جائے تو مولانا رومی نے اپنی ساری زندگی میں خون ریزی ہی دیکھی - مگر ان کی تمام شاعری میں کہیں نفرت کا ذکر نہیں، صرف محبت اور امن کا پیغام ہے - مولانا نے اپنی شاعری میں تاریکی کی بجائے اُجالے کی بات کی ہے -

ان کے خیال میں ”تعلیم کو اگر ظاہری وجود کے لیے حاصل کیا جائے تو یہ سانپ کی مانند ہے - علم اگر روح کے لیے حاصل کیا جائے تو یہ یار بن جاتا ہے“ -

اسی طرح حضرت سلطان باھوؒ نے بھی نفس کو سانپ کی مثل قرار دیا اور فرمایا:

”جس طرح سانپ کو منتر سے قابو کیا جاسکتا ہے اس طرح نفس کو بھی ذکر اللہ سے قابو کیا جاسکتا ہے“ -

اُن کے مطابق منفی خیالات مثلاً نفرت، لالچ وغیرہ تشدد کی جانب لے جاتے ہیں اور اپنے اصل تک پہنچنے کی انسانی صلاحیت کی راہ میں رکاوٹ کا باعث بنتے ہیں - ایسے منفی خیالات، جنہیں انسانی قلب کی تاریکی بھی سمجھا جاتا ہے، مٹا

دینے کی ضرورت ہے تاکہ انسانی زندگی کے اصل معنی کو سمجھا جاسکے-حدیثِ قدسی ہے:

"اے مسلمانو تم اپنے اندر خدا کی صفات کا رنگ پیدا کرو-اس طریقے سے انسان اپنے اندر جس قدر اُس یکتا ترین ذات سے مماثلت پیدا کرتا ہے اسی قدر وہ خود بھی بے مثل اور یکتا ہو جاتا ہے"-

مولانا رومی اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے کشادگی اور انکساری ہونی چاہیے وہ عالمانہ خود پسندی کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں جو جمود کی طرف لے جاتا ہے اس کی بجائے یہ عظیم بزرگ اپنے پیروکاروں کو لوگوں کے درمیان مشترکات تلاش کرنے کی تعلیم دیتے ہیں-اُن کا کہنا ہے کہ انسانوں کے درمیان یہ تمام جھگڑے، زندگی کے مادی پہلوؤں پر توجہ مرکوز رکھنے کی وجہ سے ہیں-

مولانا رومی اس بات کا بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ اپنے مخرج سے دوبارہ ملنے کے لئے، انسانی روح کو خدا اور اس کے بندوں سے مضبوط رشتہ قائم کرنے کی ضرورت ہے-خالق سے محبت کرنے کیلئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس کی تخلیق سے محبّت کرنا سیکھیں-یعنی انسانوں اور نوعِ انسانی سے محبّت کیے بغیر، کسی کو فیضِ الٰہی حاصل نہیں ہو سکتا-

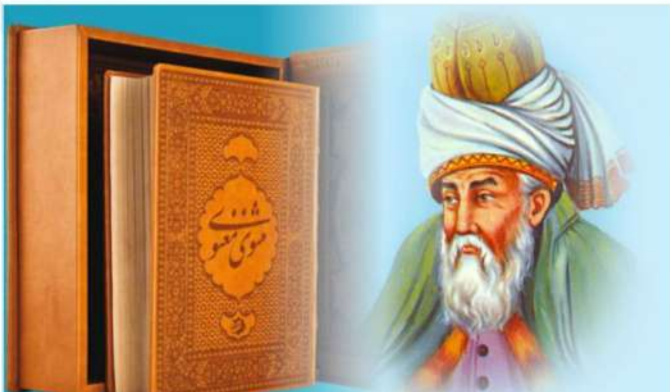

مولانا رومی نے اپنی مثنوی کا آغاز، انسانی روح کی علامت کے طور پر ایک بانسری کی کہانی سے کیا -مثنوی معنوی میں شاعری اور حکایات رومی میں نثر کو ذریعہ اظہار بنایا-انہوں نے حکایات میں بھی زندگی کے اسرار و رموز سے نہ صرف آگاہ کیا بلکہ عوام الناس کی اخلاقی تربیت بھی کی-

مولانا رومی اور حضرت سلطان باھوؒ نے نہ تو رہبانیت کا درس دیا نہ قرآن کریم اور حدیث مبارکہ کی اتباع سے غافل ہوئے اور نہ ہی فرقہ واریت کو ہوا دی-بزبانِ حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ):

ناں مَیں سُنی ناں مَیں شِیعا میرا دوہاں تُوں دِل سَڑیا ھو
مُک گئے سبھ خُشکی پینڈے جدوں دَریا رَحمت وچ وڑیا ھو

ان بزرگان کی اپنی زندگیاں بے عملی سے متصف نہیں-انہوں نے عام لوگوں کے درمیان زندگیاں گزاریں-حالات جیسے بھی رہے، اپنے نفس کو ہر قسم کی آلائش سے پاک رکھا- اگر اُن کے قول و فعل میں تضاد ہوتا تو ہم آج انہیں نہ تو اتنی محبت سے یاد کر رہے ہوتے اور نہ ہی مایوسی اور تنزلی کے اس دور میں ان کی فکر سے روشنی حاصل کرکے اُسے آگے بڑھانے کی بات کر رہے ہوتے-

خلقِ خدا سے محبت کرنا، اُن کے دکھ درد بانٹنا، اُن سے محبت کے ساتھ پیش آنا اور اپنی ذات کی مضبوطی کے ساتھ رہنمائی کرنا ہی اُن کا بہت بڑا کارنامہ تھا- اللہ تعالیٰ نے اُن کی شاعری اور نثر کو روحانی قوت بخشی اور اثر انگیزی بڑھا دی اور ایک عالَم اُن سے فیض یاب ہوا-

سلطان العارفین حضرت سخی سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) اُن انسانوں کی عقل پر افسوس کرتے ہیں جنہیں قریب رہنے والا بہت دور نظر آتا ہے اور اسے ہمیشہ باہر تلاش کرتے رہتے ہیں- آپؒ اس ساری باگ ڈور کو بے معنی اور بے سود قرار دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو اپنے ہی اندر تلاش کرنے کی تاکید کرتے ہیں- آپؒ فرماتے ہیں:

دِل دریا سمندروں ڈُوگھے کون دِلاں دیاں جانے ھو
وِچے بیڑے وِچے جھیڑے وِچے ونجھ مُوہانے ھو
چوداں طبق دِلے دے اَندر جتھے عِشق تنبُو وَنج تانے ھو
جو دِل دا محرم ہووے باھوؒ سوئی رَبّ پچھانے ھو

عشق کی انتہا یہ ہے کہ عاشق عشق کرتے کرتے معشوق بن جاتا ہے اور معشوق عاشق بن جاتا ہے- اس کے متعلق حضرت سلطان باھوؒ (رحمۃ اللہ علیہ) نورالہدیٰ میں فرماتے ہیں:

”مرتبۂ فقر مرتبۂ معشوق ہے- معشوق جو بھی چاہتا ہے عاشق اسے دیتا ہے بلکہ معشوق کے دل سے جو بھی خیال گزرتا ہے عاشق اس سے آگاہ ہو جاتا ہے اور اپنی نگاہ سے ہی اسے تمام مطالب سے بہرہ ور کر دیتا ہے“-

آپؒ کی تعلیمات کے مطابق عشق وہ روحانی جذبہ ہے جو مخلوق کو خالق سے ملا دیتا ہے- یہ عشق ہی ہے جس کی بنا پر انسان اپنی نفسانی کدورتوں، شیطانی وہمات اور کبیرہ و صغیرہ گناہوں سے کنارہ کش ہو کر اللہ تعالیٰ کی ذات میں فنا ہو جاتا ہے- بزبانِ حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ):

عِشق جنہاندے ہَڈیں رَچیا اوہ رَہندے چُپ چُپاتے ھو
لُوں لُوں دے وِچ لکھ زباناں اوہ پھِردے گنگے بَاتے ھو
اوہ کردے وُضو اِسم اعظم داتے دریا وحدت وِچ ناتے ھو
تَدوں قَبول نمازاں باھوؒ جَداں یَاراں یَار بِچھاتے ھو

حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) کی رباعیات کا ترجمہ ہے:

”مسلمان اسے کہتے ہیں جو اپنا مال اولاد اور جان اللہ کے نام پر صدقہ کر دے یہی جوہر ایمان ہے“-

آپؒ ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

”اپنے دل میں کبر و ہوا کا ذرہ بھی نہ آنے دے کہ کبر سے کبھی کوئی معزز مرتبہ پر نہیں پہنچ سکا ہے- تُو زلف محبوب کی طرح شکستہ دلی کو اپنا شیوہ بنا لے تاکہ تُو بھی ہزارہا دلوں کو اپنا دیوانہ بنا سکے“-

حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں:

پَڑھ پَڑھ عِلم مَشائخ سَداون کَرن عِبادَت دوہری ھوؔ
اَندر جُھگی پَئی لُٹیوے تَن مَن خَبر نہ موری ھو

ایک اور مقام پہ آپ فرماتے ہیں:

”باھو فقر کا طالب ہے اور فقر ہی کا مُقرب ہے- باھو کو یہ فقر حبیب خدا (ﷺ) سے نصیب ہوا ہے“-

مولانا رومؒ اور حضرت سلطان باھوؒ کی تعلیمات سے استفادہ نہ کرنا اپنے علمی ورثے کی ناقدری کے مترادف ہے- صوفیاء کرام کی تعلیمات سے تعلق کمزور پڑ جانے کے باعث معاشرے میں شدت، منافرت اور تعصب بڑھ رہا ہے چنانچہ ہمیں اپنی اسی بنیاد کی جانب واپس لوٹنا چاہیئے-

زبان کے حوالے سے دیکھا جائے تو مولانا رومیؒ کا کلامِ سر تا سر فارسی زبان میں ہے جبکہ حضرت سلطان باھو صاحب (قدس اللہ سرّہٗ) نے اپنی مادری زبان پنجابی کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کو بھی ذریعہ اظہار بنایا- دونوں عارفانِ کامل نے زبان و بیان کی تمام تر شعری نزاکتوں کے تقاضے بھرپور فنی مہارت کے ساتھ نبھاتے ہوئے اپنے افکارِ عالیہ کو شعری روپ میں پیش کیا- درج بالا موضوعات جو دونوں عارفانِ کامل کے ہاں مشترک پائے جاتے ہیں اگر ان کا بغور مطالعہ کیا جائے تو جو سب سے بڑا درس ان میں ملتا ہے وہ ”وحدت انسانی“ کا تصور ہے-

آیئے ہم سب مل کر امن، محبت اور رواداری کے اس پیغام کو عام کریں تاکہ ہماری نسلیں بھٹکنے سے بچ جائیں-

آخر میں ایک تجویز اس فورم کے ذریعے قارئین تک پہنچانا چاہوں گی کہ ہمارے صوفیاء کرام کی فکر کو عام لوگوں تک پہنچانے کے لیے ٹھوس بنیادوں پر کام کیا جانا چاہیئے- اُن کے کلام کے تراجم ہونے چاہئیں، ڈاکومینٹریز بنی چاہئیں- ان کے کلام کی موسیقی کے ذریعے بھی عام لوگوں تک رسائی ممکن ہو سکتی ہے- دیگر ڈیجیٹل ذرائع میں بھی اُن کے پیغام کو برتا جا سکتا ہے- تاکہ ان کی فکر کو عام کر کے نوجوان نسل کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو جلا بخشی جا سکے-

☆☆☆

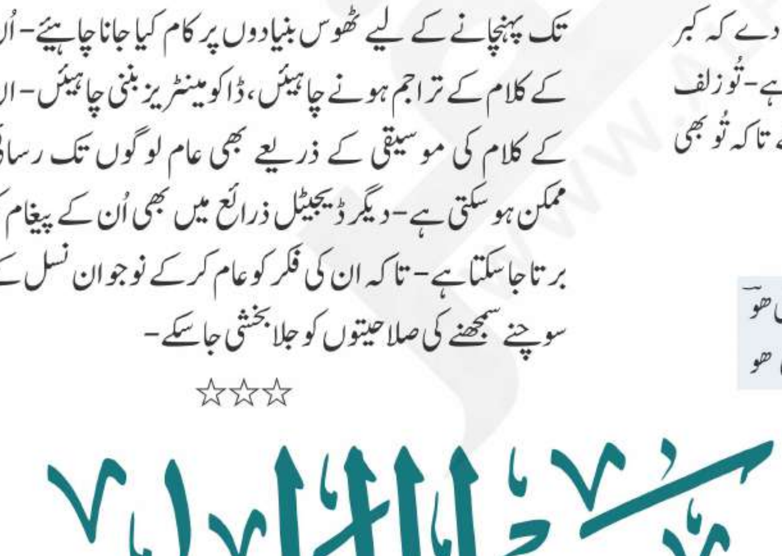

"ہووِن سونا، سڈاوِن سکا"

حضرت سلطان باھُو کی تعلیمات سے عجز کی خوشبو کی تلاش

ڈاکٹر ساجد محمود
پوسٹ گریجویٹ کالج، مانسہرہ

سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے تخلیق آدم سے قبل ہی انسان کو خلفیہ ارضی قرار دیا- اسی مقام بلند کے سبب انسان مسجود ملائک ٹھہرایا گیا اور کائنات رنگ و بو میں اسے مرکزیت عطا کر کے "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ"[1] کے درجہ افتخار سے نوازا گیا- تاکہ دوسری مخلوقات کو باور کرایا جاسکے کہ یہ اشرف المخلوقات ہے-انسان کو یہ شعور ودیعت کیا گیا کہ اپنے اعلیٰ و ارفع تخلیق کے پیش نظر تیری عظمت مسلمہ ہے- تاریخ گواہ ہے کہ انسان کی اعلیٰ فکری صلاحیتیں اس کی عظمت کو ثابت کرنے میں صرف ہوئیں کہ کائنات کے تمام تر مظاہر اس کی عظمت کے سامنے سر تسلیم خم ہیں-یوں ہر زمانے کے اہل دانش اور اہل باطن نے انسان کو "جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے" کی ذمہ داری یاد دلانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی- اہل باطن یعنی ولی اللہ کے نزدیک انسان کے لیے "انسان" ہونے کا معیار بھی انتہائی کڑا ہے-وہ محض نسل آدم سے تعلق کو انسان ہونے کا معیار نہیں سمجھتے، کیونکہ ذریت آدم سے ہونا "آدمی" ہونے کی دلیل تو ہے لیکن کامل انسان ہونے کی نہیں- انسان کے منصب جلیلہ پر براجمان ہونے کے لیے آدمی کو سنگلاخ ہفت خواں طے کرنا لازم ہے-ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ"[2]

"بے شک ہم نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا فرمایا"-

اسی حقیقت کے پیش نظر انسان کو پھر تکبر کس بات پہ ہے-اس کے باوجود کہ اللہ تعالیٰ کی شان نے اسے عظمت سے نوازا-اس لیے اس عظمت کے بموجب جو پہلی اور انتہائی دشوار راہ ہے وہ عجز و انکساری کی ہی ہے- آقا کریم (ﷺ) کا فرمان ہے:

"صدقہ مال کو کم نہیں کرتا، اور عفو و درگزر کرنے سے آدمی کی عزت بڑھتی ہے، اور جو شخص اللہ کیلئے تواضع و انکساری اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا رتبہ بلند فرما دیتا ہے"-[3]

عاجزی و انکساری صراط مستقیم میں پیش آنے والی مشکلات و خطرات میں قلعہ بندی کا کام دیتی ہے-اولیاء اللہ کا یہ طریق رہا ہے کہ انہوں اپنے کلام میں عاجزی کا عملی نمونہ دکھایا اور عمل میں حلیم ہونے کا ثبوت اپنے آپ کو کم تر بنا کر پیش کیا-

عجز کی مثالیں انبیاء (علیہم السلام) کی دعاؤں میں بھی موجود ہیں اور اولیاء اللہ کے کلام اور نثری تصانیف میں بھی، جن کی حقیقت یہی ہے کہ یہ انسانوں کو سیدھا راستہ دکھانے اور مالک حقیقی سے رابطے کا ذریعہ اور تعلیم ہیں-اس پس منظر کو بیان کرنے کا مدعا یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے خلافت کا تاج پہنا کر عزت و عظمت جیسی کامیابی سے ہمکنار کیا-اس کامیابی کو تسلسل سے برقرار رکھنے کے لیے انبیاء اور اولیاء اللہ نے اپنی

[1](الاسراء:70) [2](الدھر:2) [3](سنن ترمذی/کتاب البر والصلۃ)

تمام حیات کو عملی طور پر پیش کیا جہاں عجز و انکساری کے درخشاں گلستاں اپنی خوشبو کے سبب مہکتے ہوئے یہ درس دے رہے ہیں کہ تکبر سے پاک اور عجز سے بھرپور زندگی ہی دوام کی علامت ہے-

حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) کے کلام اور تصانیف میں عجز و انکساری:

حضرت سلطان باھوؒ کی حیات طیبہ ایک اجلے آئینے کی طرح ان کے کلام اور تصانیف کے علاوہ ان کے خانوادے کی صورت ہمارے سامنے ہے- آپؒ نے سرور کونین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے رہنمائی پاکر اپنی فکر اور سخاوت کو اپنے کلام میں انسانوں کے لیے پیش فرمایا- آپؒ کی زندگی ان کے اپنے عہد اور آنے والے زمانوں کے انسانی اخلاق کیلئے عظیم ترین نمونہ ہے جو انسان کی فلاح کا ایک احسن وسیلہ ہے- آپؒ کی حیات عجز کی تمثال اور انکساری کا ہمالہ تھی- آپؒ ”نور الھدیٰ“ میں فرماتے ہیں:

قتل کنُ ایں نفس را با تیغ ذات
ہر کہ بکشد نفس را یا بد نجات

”اِس نفس کو (اسمِ اللہ) ذات کی تلوار سے قتل کر دے کہ جو اُسے قتل کرتا ہے وہ نجات پا جاتا ہے“-

عجز و انکساری کے لیے عربی کا لفظ ”تواضع“ استعمال ہوا ہے جس کا معنی ہے ”خود کو کم درجہ پر سمجھنا“، جس کا متضاد تکبر ہے یعنی اپنی کسی خوبی کی وجہ سے اکڑ جانا اور دوسروں کو خود سے کم تر جاننا- حضرت سلطان باھوؒ نے اس تصور کی انتہا تک پہنچ کر فرمایا:

بُوہتی مَیں اوگن ہاری لاج پئی گل اُسدے ھو
پَڑھ پَڑھ عِلم کرن تکبّر شیطان جِیہے اُوتھے مسدے ھو

حضرت انس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں:

”جب کوئی شخص حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ملاقات کے وقت مصافحہ کرتا تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنا ہاتھ اس وقت تک نہیں کھینچتے تھے، جب تک دوسرا شخص اپنا ہاتھ نہ کھینچ لے، آپ اپنا چہرہ اس وقت تک نہیں پھیرتے تھے جب تک ملاقات کرنے والا شخص خود اپنا چہرہ نہ پھیر لے“-[4]

حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) کے خاندان نے مصطفیٰ کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مشن کو ہر دور میں عملی مظہر بنایا- آپؒ کی تصنیفات اور کلام کو ہر عہد کی جدید زبان میں ترجمہ کا لباس پہنا کر طالبان مولیٰ کیلئے آسان فرمایا- بانئ اصلاحی جماعت و تنظیم العارفین سلطان الفقر حضرت سلطان محمد اصغر علی (رحمۃ اللہ علیہ) نے اس مادیت کے دور میں تصوف کے حقیقی فلسفہ ”عمل“ کے لیے بیسویں صدی کے آخری دو عشروں میں اصلاحی جماعت کی بنیاد رکھی- اس جماعت کا مقصد ظاہر و باطن، تمام معاملات زندگی میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے آگے سر تسلیم خم کرنے اور عشق رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو رگ رگ میں جاری کرنے کا بیڑا اٹھایا- یوں صدیوں سے سطحی مسائل میں الجھے دردمندوں میں ایک نئی روح پھونک کر انہیں عجز و انکساری کی تعلیمی استعداد سے نواز کر انسان کے حقیقی مقام یعنی علامہ محمد اقبال کی زبان میں ”رفعت میں مقاصد کو ہم دوش ثریا کر“ کا مظہر بنا دیا-

آپؒ نے اس امر کا اعادہ فرمایا کہ دنیا کی محبت انسان کے لیے اس کے حقیقی مقصد حیات اور اللہ تعالیٰ کی چاہت کے درمیان کسی صورت حائل نہیں ہونی چاہیے، اس لیے اپنے آپ کو انہوں نے طالب مولیٰ کے حقیقی روپ میں ہمیشہ رکھا اور وابستگان کو بھی اس کے لیے تیار بھی کیا- حضرت سلطان باھوؒ فرماتے ہیں:

[4](سنن ترمذی، کتاب القیامہ)

دَلیلاں چھوڑ وجودوں ہو ہُشیار فَقِیرا ھو
بَنھ توکّل پنچھی اُڈدے پلّے خرچ نہ زِیرا ھو
روز روزی اُڈ کھان ہمیشہ نہیں کردے نال ذَخیرا ھو
مولا خرچ پوہنچاوے باھوؒ جو پتھر وچ کیڑا ھو

حضور غوث الاعظم (رحمۃ اللہ علیہ) اپنی تصنیف ”سر الاسرار“ میں فرماتے ہیں:

”ابلیس نے جب اپنی بد فعلی کو تقدیر الٰہی کی طرف منسوب کیا تو وہ کافر و مردود ہو گیا- حضرت آدم (علیہ السلام) نے جب اپنی نافرمانی کو اپنے نفس کی طرف منسوب کیا تو فلاح پا گئے اور اُن پر رحم کیا گیا“-

شیطان نے تکبر کیا، تکبر نیکیوں کو گناہوں اور انسانیت کو حیوانیت میں تبدیل کرنے کا شیطانی آلہ ہے- تاریخ گواہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ سے رتبہ ملا وہ اُس کے حضور عاجزی سے ملا- شکستگی اور عاجزی ہی بندگی کا نام ہے اور بندگی ہی انسان کا اعلیٰ مقام ہے- عربی زبان میں ایک مثال ہے کہ متکبر کی مثال اس شخص جیسی ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہو، اب وہ پہاڑ کے اوپر سے نیچے چلنے پھرنے والوں کو چھوٹا سمجھتا ہے اس لیے کہ اوپر سے اس کو وہ لوگ چھوٹے نظر آرہے ہیں، اور جو لوگ نیچے سے اس پہاڑ پر دیکھنے والے ہیں وہ اس کو چھوٹا سمجھتے ہیں- بالکل اسی طرح ساری دنیا متکبر کو حقیر سمجھتی ہے اور متکبر دنیا والوں کو-

شاہ عبد الطیف بھٹائی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں:

”جب تک خود کو سرمے کی طرح باریک نہیں کرو گے، تب تک محبوب تجھے اپنی آنکھوں میں کس طرح لگائے گا“-

مولانا روم کے مطابق:

”محبوب کے راہ میں جھکنا ہی ترقی ہے“-

بقول علامہ اقبال:

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہیے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) اپنے کلام میں عجز و انکساری پر صدقے اور قربان کے الفاظ کہتے ہیں:

سَو ہزار تِنہاں توں صَدقے جھیڑے مُنہ نہ بولن پھکّا ھو
لکھ ہَزار تِنہاں توں صَدقے جھیڑے گَل کریندے ہِکّا ھو
لکھ کروڑ تِنہاں توں صَدقے جھیڑے نَفس رکھیندے جھِکّا ھو
نِیل پَدم تِنہاں توں صَدقے باھوؒ جھیڑے ہوون سون سڈاوِن سِکّا ھو

حضرت سلطان باھوؒ ”کلید التوحید کلاں“ فرماتے ہیں:

”وصال الٰہی عاجزی و انکساری سے حاصل ہوتا ہے- الٰہی، تیرا راز ہر صاحب راز (مرشد کامل) کے سینے میں جلوہ گر ہے- تیری رحمت کا دروازہ ہر ایک کے لیے کھلا ہے- تیری بارگاہ میں ”عاجزی“ سے جو آتا ہے خالی ہاتھ نہیں لوٹتا- خود پرستی چھوڑ کر (عاجزی اختیار کر) غرق نور ہو جا تاکہ تجھے ایسی حضوری نصیب ہو کہ وصل کی حاجت ہی نہ رہے“-

لہٰذا! عجز اور انکساری اپنا کر اپنا دامن پاکیزہ کر لیا جائے کیونکہ تکبر کسی طور ہمیں زیب نہیں دیتا- خلاصہ کلام یہ ہے کہ انسانیت کی معراج عاجزی اور انکساری ہے- بزبانِ حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ):

ناں مَیں سیر ناں پَا چھٹاکی ناں پوری سرساہی ھو
ناں مَیں تولہ ناں مَیں مَاسا ہُن گل رَتیاں تے آئی ھو
رَتی ہونواں وَنج رَتیاں تُلاں اوہ بھی پوری ناہی ھو
وَزن تول پورا ونج ہوسی باھوؒ جداں ہوسی فَضل الٰہی ھو

☆☆☆

نسلِ نو کی کردار سازی

تعلیماتِ مولانا روم اور حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہما) کے تناظر میں

مفتی محمد شیر القادری
صدر تحقیق: جامعہ غوثیہ عزیزیہ انوار حق باھو سلطان

مولانا جلال الدین رومی اور سلطان العارفین حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہما) کا زمانی اعتبار سے سوا چار صدیوں سے بھی زیادہ کا فاصلہ ہے اور مکانی اعتبار سے بھی ہزاروں میلوں کا فاصلہ- لیکن احساسات کو دیکھا جائے تو ایک جسم کے اعضا کی طرح دکھائی دیتا ہے- بلکہ اُن کی فکر اور تعلیمات میں بہت ہی زیادہ ہم آہنگی پائی جاتی ہے- آخر کیوں؟

اس کی وجہ اُن کا مشن، مقصد، تحریک اور منزل ایک ہے- مقصد اور منزل ایک ہونے کی وجہ سے فکر میں ہم آہنگی آجاتی ہے، چاہے زمانی اور مکانی اعتبار سے جتنا بھی فاصلہ کیوں نہ ہو-

کردار سازی دراصل ماڈل اور نمونہ کا موضوع ہے اور کردار سازی کی اہمیت اگر ہم دین اسلام کی روشنی میں جاننا چاہیں تو جب حضور نبی کریم (ﷺ) نے اعلان نبوت فرمایا تو بعد از اعلان نبوت قریش مکہ کی طرف سے وحی الٰہی اور توحید الٰہی پر اعتراضات کئے گئے، تو سیّدی رسول اللہ (ﷺ) نے حکم الٰہی سے اپنا 40 سالہ کردارِ زندگی اُن کے سامنے پیش کیا- ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

”فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ“[1]

”تو میں اس سے پہلے تم میں اپنی ایک عمر گزار چکا ہوں تو کیا تمہیں عقل نہیں“-

بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اسلام کی بنیاد کردار پر ہے- اگر کردار (عمل) کو اسلام سے نکال دیا جائے تو پھر تھیوری باقی رہ جائے گی، جو دینِ اسلام کے مقاصد کو پورا کرنے کیلئے کافی نہیں ہے-

یہاں پر مختلف جہتوں اور فکر و نظر کے لحاظ سے کئی سوال و جواب ہو سکتے ہیں، لیکن یہاں پر دو سوالات کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کروانا چاہتا ہوں-

1. **کردار پر کیوں زور دیا گیا؟**
2. **کردار سازی کا اصول کیا ہے؟**

ایک بات ہمیشہ ذہن نشین رہنی چاہئے کہ باکردار انسان بننے کیلئے اُسے ایک نمونہ چاہئے، کردار سازی یا باکردار آدمی بغیر ماڈل اور نمونہ کے نہیں بن سکتا- اس لئے انبیا و رسل (علیہم السلام) کو مبعوث فرمایا گیا- جن کا مقصد ہی یہی تھا کہ لوگوں میں ماڈل اور نمونہ پیش کیا جائے، تاکہ لوگ اس نمونہ میں ڈھل جائیں-

ایک کامل نمونہ کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

اِس کی وضاحت یہ ہے کہ دراصل یہ اللہ کے نور کے ظہور کی ڈیمانڈ ہے کہ جب تک ایک نمونہ کامل نہ ہو اس وقت تک وجود سے نور الٰہی کا ظہور ممکن نہیں ہے- قرآن کریم میں دو مقام پہ اسی نظریے کو بیان کیا ہے- پہلا مقام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

---

[1](یونس:16)

"فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ"[2]

"پھر جب میں اسے ٹھیک بنالوں اور اس میں اپنی طرف کی روح پھونکوں تو تم اس کے لئے سجدے میں گرنا"۔

اس کی بہت ساری تشریحات کے ساتھ ایک وضاحت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ انسان کامل کی طرف اشارہ ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ کے نور کا ظہور انسان کامل کی صورت میں ہوتا ہے۔

قرآن نے دوسرے مقام پر آدمی کو کلی اور عملی طور پر انسان کامل ہونے کا حکم فرمایا ہے:

"یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً"[3]

"اے ایمان والو! اسلام میں پورے داخل ہو"۔

یہ دراصل انسان کی تکمیل کی طرف اشارہ ہے کیونکہ انسان کی اکملیت علم سے ناممکن ہے۔اگر انسان کی اکملیت علم سے ممکن ہوتی تو اللہ تعالیٰ انبیاورسل (علیہم السلام) کو مبعوث نہ فرماتا بلکہ لٹریچر کی صورت میں صرف دین نازل کیا جاتا۔یاد رکھیں! علم سے معلومات میں اضافہ ضرور ہوتا ہے۔لیکن کردار میں ڈھلنے کیلیے ایک نمونہ چاہیے فقط علم نہیں۔ایک عملی نمونہ چاہیے جس کو دیکھ کر انسان اس کے کردار میں ڈھل سکے۔اس لئے انسان کامل کی صورت کو وجود میں لایا گیا۔جب کردار کی تکمیل ہوتی ہے یعنی جب ہر صفت اپنے کمال کو پہنچتی ہے،تو آدمی انسان کامل بن جاتا ہے تو وہ وجود مبارک اللہ تعالیٰ کے نور کے ظہور کے اظہار کے لائق بن جاتا ہے،یہی وجہ تھی کہ صوفیاء کرام نے دوغلے پن کو قبول نہیں کیا کہ ظاہر کچھ ہو اور باطن کچھ۔کیونکہ یہ انسان کے کامل ہونے میں رکاوٹ ہے۔حضرت سلطان باھوؒ فرماتے ہیں:

زبانی کلمہ ہر کوئی پڑھدا دل دا پڑھدا کوئی ھو

یہ اس دوغلے پن کی نفی ہے کہ ظاہر اور باطن میں تضاد ہو کیونکہ صوفیاء کا موضوع یہ ہے کہ انسان کے وجود سے اللہ تعالیٰ کے نور کا ظہور کیسے ممکن ہے؟ باقی جتنی بھی نیک اور اچھی باتیں ہیں وہ سب اس طرح ہیں جس طرح آدمی حج اور عمرے کیلئے جائے تو اس کے ذیل میں آدمی کو بہت سی عبادات اور زیارات میسر آجاتی ہیں۔لیکن اصل مقصد، قربِ خداوندی اور انوار و تجلیاتِ الٰہی کا مشاہدہ حاصل نہیں ہوتا۔

حضرت سلطان باھوؒ فرماتے ہیں:

تسبی پھری تے دِل نہیں پھریا کی لیناں تسبی پھڑ کے ھو

الغرض! صوفیاء کی تعلیمات کا مقصد یہ ہے کہ انسان کا ظاہر اور باطن ایک ہو، زبان جس بات کا اقرار کرے دل اس کی تصدیق کرے۔اگر انسان کا ظاہر تو پاک ہو لیکن باطن میں پلیدی ہو، تو اس دوغلے پن کی نفی کی گئی ہے۔جیسا کہ حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) "عین الفقر" میں فرماتے ہیں:

باھو! نفس پلید بر تن جامه پاک چه سود
دردل همه شرک است سجده بر خاک چه سود

"اے باھو! نفس اگر پلید ہے تو تن پر پاکیزہ لباس پہننے کا کیا فائدہ ہے؟ دل میں شرک ہی شرک ہے یعنی دل شرک سے بھرا ہوا ہے تو خاک پر سجدہ کرنے کا کیا فائدہ؟"

ایک اور مقام پہ فرماتے ہیں:

بر زبان تسبیح در دل گاؤ خر
ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

"اگر زبان پر تسبیح جاری ہو اور دل گاؤ خر (خیالات دنیا) میں غرق ہو تو ایسی تسبیح کیا اثر دکھائے گی؟"

مولانا روم (رحمۃ اللہ علیہ) نے مثنوی شریف دفتر دوم میں مسجد ضرار کا واقعہ بیان کیا ہے۔مسجد ضرار جو ایک سازش کے تحت بنائی گئی تھی۔چونکہ اس کا باطن یعنی نیت اور مقصد

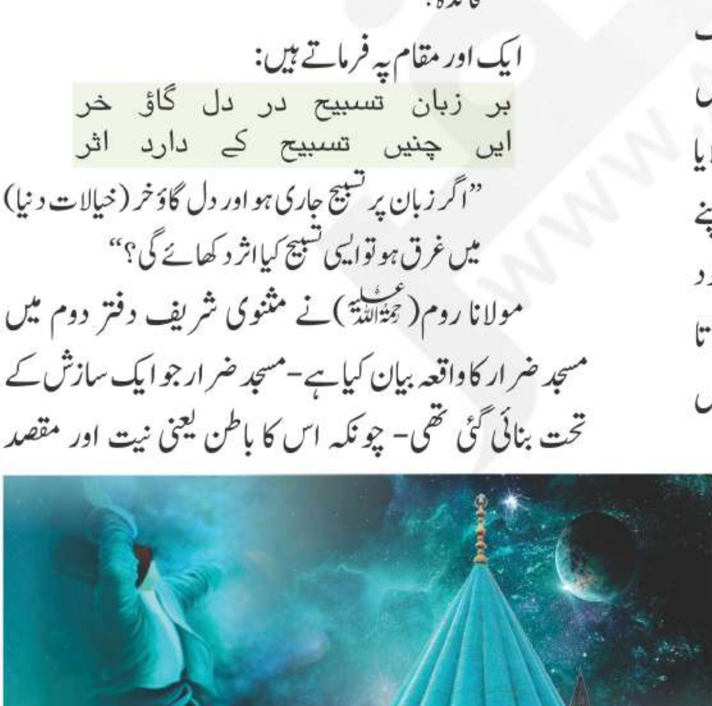

[2](سورۃ ص:72) [3](البقرہ:208)

ویرانی تھا، وہ اخلاص اور نیک نیتی کی بنیاد پہ وجود میں نہیں آئی تھی- اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم (ﷺ) کو ارشاد فرمایا:

"لَا تَقُمْ فِیْهِ اَبَدًا"[4]

"اس مسجد میں تم کبھی کھڑے نہ ہونا"-

یعنی آپ (ﷺ) نے اس مسجد میں کبھی تشریف نہیں لے جانا- اس کے برعکس جو دوسری مسجد جس کی بنیاد تقویٰ پر ہے اس کے متعلق ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

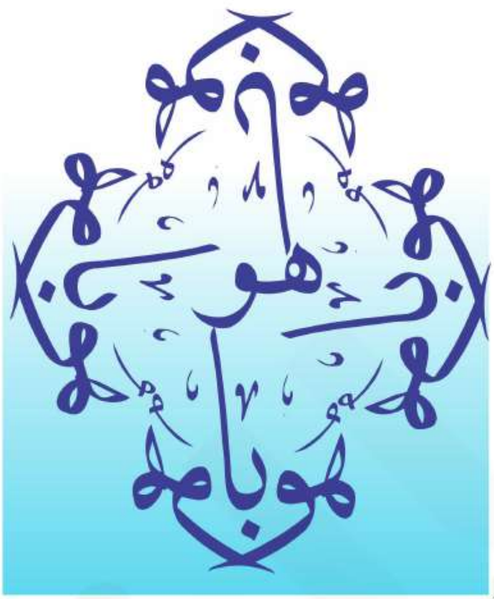

"اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِیْهِ"[5]

"وہ اس قابل ہے کہ تم اس میں کھڑے ہو"-

یعنی آپ (ﷺ) نے اس میں تشریف لے جانا ہے وہ کھڑے ہونے کے زیادہ حقدار ہے- مولانا روم (رحمۃ اللہ علیہ) مسجد ضرار کا واقعہ بیان کرکے یہ بتلا رہے ہیں کہ دیکھو ظاہراً تو مسجد ضرار بھی مسجد تھی اور جس کی بنیاد تقویٰ پہ رکھی گئی تھی وہ بھی مسجد تھی- گویا ظاہر کے اعتبار سے تو دونوں مسجد ہیں، لیکن دونوں کے باطن میں فرق ہے- مسجد ضرار کا باطن ویران ہے- بنانے کا مقصد اور نیت درست نہیں ہے اس کی جانب جانے سے روکا جا رہا ہے اور دوسری مسجد جس کا ظاہر بھی درست تھا اور باطن بھی، نیک نیتی اور تقویٰ کی بنیاد پہ بنائی گئی تھی وہاں پہ رسول اللہ (ﷺ) کو ترغیب دی جا رہی ہے کہ وہ مسجد اس بات کی زیادہ حقدار ہے کہ آپ (ﷺ) وہاں پہ تشریف لے جائیں- نتیجہ یہ سامنے آیا کہ جہاں ظاہر اور باطن کا تضاد ہے، اگرچہ ظاہر درست ہے لیکن باطن ویران ہے تو وہاں نور مصطفٰے (ﷺ) کی جلوہ گری نہیں ہو سکتی- صوفیاء کرام نے یہ تصوّر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور آقا کریم (ﷺ) کے نور کا ظہور کا اصول یہی ہے کہ ظاہر کے ساتھ ساتھ باطن بھی پاکیزہ ہو- کیونکہ جب یہ دونوں پاکیزہ ہوتے ہیں تو انسان اپنی اکملیت پہ پہنچ جاتا ہے- اس میں دوئی اور غیریت ختم ہو جاتی ہے- جیسا کہ حدیث قدسی میں فرمایا گیا ہے:

"كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِيْ يَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِيْ يُبْصِرُ بِهٖ وَيَدَهُ الَّتِيْ يَبْطِشُ بِهَا، وَرِجْلَهُ الَّتِيْ يَمْشِيْ بِهَا"[6]

"میں اس کے کان ہو جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور میں اس کی آنکھیں ہو جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے اور میں اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور میں اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے"-

اب وہ وجود مبارک اس لائق بن گیا ہے کہ اس سے نور الٰہی کا ظہور ہو سکے- مولانا روم (رحمۃ اللہ علیہ) نے مسجد ضرار کی مثال دے کر اس مسئلہ کو سمجھایا ہے-

مولانا رومی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں:

"حضرت بایزید بسطامیؒ جب حج کیلئے جا رہے تھے تو ایک شیخ کامل نے کہا کہ میرے گرد سات مرتبہ طواف کر لے-

وین نِکو تر از طوافِ حج شمار

"اور اس کو حج کے طواف سے بہتر سمجھ"-

وجہ کیا تھی؟ اس کی وجہ شیخ صاحب نے خود بتا دی کہ:

چوں مرا دیدی خدا را دیدہ ای

"جب تو نے مجھے دیکھا تو (گویا) خدا کو دیکھ لیا"-

یعنی میرے دیکھنے سے تجھے اللہ تعالیٰ کی ذات کے انوار و تجلیات دیکھنے نصیب ہو جائیں گے-

چشم نیکو باز کن در من نگر
تا بہ بینی نورِ حق اندر بشر

(اے بایزید!) تو اچھی طرح آنکھ کھول اور مجھے دیکھ تا کہ تو بشر (کے باطن میں چھپا) اللہ تعالیٰ کا نور دیکھے"-

حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) نے اسی مسئلے کی وضاحت میں متعدد باب رقم کئے ہیں- کیونکہ در حقیقت صوفیا کرام کی

[4](التوبہ:108)

[5](التوبہ:108)

[6](صحیح البخاری، کتاب الرقاق)

تعلیمات کا اصل موضوع یہ ہے کہ آدمی کے وجود سے نور الٰہی کو کیسے دیکھا جاسکتا ہے؟صوفیا کرام کا دودھ سے گھی کو نکالنے کا عمل بیان کرنا اسی مسئلے کی وضاحت میں ہے-

حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں:

هر كه بيند رُوئے من شد اولياء
روئے من با رُوئے رحمت مصطفےؐ

”جس نے بھی مجھے دیکھا وہ اللہ کا ولی ہو گیا، کیونکہ میرے چہرہ پر حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے رُخِ رحمت کا نور چھایاہوا ہے“-

جس طرح آقا کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے-اس لئے جب تک کوئی ماڈل اور نمونہ نہ ہو، اس وقت تک کردار سازی نہیں کی جاسکتی-یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیا کرام (علیہم السلام) کو بطور نمونہ مبعوث فرمایا ہے اور انبیاء کرام (علیہم السلام) کے بعد جتنے بھی صوفیا کرام ہیں، یہ وہ ماڈل اور نمونہ ہائے انوار ہیں جن کے وجود سے اللہ تعالیٰ کے نور کا اظہار ہوتا ہے-یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں اتنے فنا ہو جاتے ہیں اور اتنا قرب پالیتے ہیں کہ وہ ان کے ہاتھ بن جاتا ہے، ان کی آنکھیں بن جاتا ہے- لیکن یہ سارا سفر بغیر استاد (مرشد کامل) کے نہیں ہو سکتا- جیسا کہ مولانا روم (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں:

هيچ چيزے خود بخود چيزے نشد
هيچ آهن خود بخود تيغے نشد
مولوى هر گز نشد مولائے روم
تا غلام شمس تبريزى نشد

”کوئی چیز خود بخود کوئی خاص چیز نہیں بن جاتی، کوئی بھی لوہا خود بخود تلوار نہیں بن سکتا- مولوی کبھی بھی مولانا روم نہیں بن سکتا جب تک کہ شمس تبریزی کی غلامی اختیار نہیں کرتا“-

الغرض! جس کو بھی اللہ تعالیٰ کی ذات کا عرفان نصیب ہوتا ہے وہ شیخ کامل کی صحبت اور توجہ سے نصیب ہوتا ہے-

☆☆☆

اصلاحِ نفس کے اصول
افکارِ حضرت سلطان باھو رحمۃ اللہ علیہ
سے نوجوانوں کی روحانی تربیت

لئیق احمد

نفس کے لغوی معنی کی بحث کرتے ہوئے علامہ سیّد مرتضٰی زبیدی (المتوفی 1205ء) لکھتے ہیں کہ:

”نفس روح کو بھی کہتے ہیں، کسی شے کی حقیقت کو بھی نفس کہتے ہیں- سانس کو بھی نفس کہتے ہیں جبکہ جسم اور روح کے مجموعے کو بھی نفس کہا گیا ہے- قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کیلئے بھی نفس کا لفظ استعمال فرمایا ہے“-

لیکن جب ہم تزکیہ نفس یا اصلاحِ نفس کی بات کرتے ہیں تو اس نفس سے اصطلاح میں مراد ایک ایسی غیر مادی شے ہے جس میں خیر اور شر کی قابلیت موجود ہے- دوسری ہر قوت کی طرح اس کا استعمال اسے خیر یا شر بنا دیتا ہے- جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

”وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰىهَا ۝ قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰىهَا“[1]

”اور جان کی اور اس کی جس نے اسے ٹھیک بنایا- پھر اس کی بدکاری اور اس کی پرہیز گاری دل میں ڈالی- بے شک مراد کو پہنچا جس نے اسے ستھرا کیا- اور نامراد ہوا جس نے اسے معصیت میں چھپایا“-

جب انسان نفس کو انسانیت کی بلند اقدار، ان کے تحفظ اور استحکام کے لیے عمل میں لاتا ہے تو یہ خیر کا موجب ہو جاتا ہے اور جب انسان اپنی ناجائز خواہشات کے لیے نفس کو عمل میں لاتا ہے تو موجبِ زیاں بنتا ہے- صوفیاء کرام نے نفس کی چار حالتیں یا اقسام بیان کی ہیں- جس کی مختصر وضاحت درج ذیل ہے:

1- نفس امارہ:

یہ سب سے زیادہ گناہوں کی طرف مائل کرنے والا اور دنیوی رغبتوں کی طرف کھینچ کر لے جانے والا نفس ہے- فواحش اور منکرات، لذات و شہوات اور جملہ بدکاریوں کی طرف بھی یہی نفس راغب کرتا ہے- جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

”اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوۡٓءِ“[2]

”بے شک نفس یقیناً برائی کا بڑی شدت سے حکم دینے والا ہے“-

2- نفس لوامہ:

اس مقام پر دل میں نور پیدا ہو جاتا ہے جو باطنی طور پر ہدایت کا باعث بنتا ہے- جب نفس لوامہ کا حامل انسان گناہ یا زیادتی کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے تو اس کا نفس اسے فوری طور پر سخت ملامت کرنے لگتا ہے- اسی وجہ سے اسے لوامہ (سخت ملامت کرنے والا) کہتے ہیں- قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس نفس کی قسم کھائی ہے-

”وَلَاۤ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَةِ“[3]

”اور میں نفس لوامہ کی قسم کھاتا ہوں“-

نفس لوامہ کی صفات میں حلال کی رغبت، لوگوں کے لیے نفع بخش، دوسروں کا بوجھ اٹھانا، لغویات سے گریز اور پسندیدہ اخلاق شامل ہیں- بُری صفات جیسا کہ مکر و فریب، ہوا و ہوس، خود بینی و خود پسندی، تکبر، اعتراض، قہر و جبر اور خواہشات نفسانی شامل نہیں-

[1] (الشمس:7-11)

[2] (یوسف:53)

[3] (القیامہ:2)

3- نفسِ ملہمہ:

یہ دل میں نیکی اور اطاعت کے خیالات ڈالتا ہے-یعنی الہام کرتا ہے- اسی نیک الہام کے عمل کے باعث ملہمہ کہتے ہیں-نفس ملہمہ کی نمایاں صفات قناعت، سخاوت، علم، تواضع و انکساری، توبہ، صبر، تحمل، برداشت، معمولی رزائل مثال میں بڑے گناہوں اور خرابیوں کی صورت میں نظر آتے ہیں-

4- نفسِ مطمئنہ:

نفس مطمئنہ اولیاء اللہ کا نفس ہے- جو بری خصلتوں سے بالکل پاک صاف ہو جاتا ہے-نیک اور پاکیزہ فضائل سے متصف ہو جاتا ہے- اور بارگاہ الٰہی سے اپنا ربط و تعلق قائم کرکے حالت اطمینان پر فائز ہو جاتا ہے- اسی وجہ سے اسے نفس مطمئنہ کہتے ہیں- قرآن مجید میں اس نفس کو یوں خطاب فرمایا ہے:

”یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ○ارْجِعِیْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً“[4]

”اے نفس مطمئنہ اپنے رب کی طرف لوٹ آ“-

حضرت سخی سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) ”عین الفقر“ میں ان نفس کی چار حالتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”دائرہ شریعت میں آدمی کا نفس امارہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ یہ تمہارا دشمن ہے اِسے ماردو-الٰہی! مجھے بصارت دے کہ مَیں اِسے دیکھوں اور قتل کروں- دائرۂ طریقت میں نفس لوّامہ ہوتا ہے، اُس کی لذّات اور چاہت کو پامال کرکے آگے بڑھ جاؤ- دائرۂ حقیقت میں نفس ملہمہ ہوتا ہے، اُسے عشق وذکر اللہ کی آگ میں موم کر دے حتیٰ کہ یہ مرنے سے پہلے مر جائے - دائرۂ معرفت میں نفس مطمئنہ ہوتا ہے جو حقیقی طور پر مطیع، با اخلاص، موحدِ خاص الخاص، محرمِ اسرارِ محمد رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور غیر ماسویٰ اللہ سے بیزار ہوتا ہے اور ہمیشہ استغفار کرتا رہتا ہے:”الٰہی! ہم تیری مغفرت چاہتے ہیں اور تیری ہی طرف رجوع کرتے ہیں“-

حضرت سُلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) نے اپنی تصانیف مبارکہ میں کثرت سے نفس کے اوصاف اور صفات کا ذکر کیا ہے- راقم نے آپؒ کی 28 تصانیف مبارکہ سے استفادہ کیا ہے، جن پر تحقیق و ترجمہ سیّد امیر خان نیازی صاحب یا کے بی نسیم صاحب نے کیا ہے-

آپ (رحمۃ اللہ علیہ) کی ان 28 تصانیف مبارکہ میں سے 7 تصانیف مبارکہ کلید التوحید کلاں، عین الفقر، امیر الکونین، محک الفقر کلاں، محبت الاسرار، جامع الاسرار، عین العارفین شامل ہیں- جن میں آپؒ نے نفس کے احوال و اوصاف کو بیان کرنے کے لیے باقاعدہ باب باندھا ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

- کلید التوحید کلاں، ایڈیشن: چہارم، مترجم: سید امیر خان نیازی سروری قادری، اشاعت: جنوری 2015ء، باب: احوالِ معرفتِ وصال، فناءِ نفس، زندگیٔ قلب و بقاءِ روح صفحہ نمبر:374 سے 551-
- عین الفقر، ایڈیشن:39، مترجم: سید امیر خان نیازی سروری قادری، اشاعت: اکتوبر2019ء، باب: تجلیات و تحقیقاتِ مقاماتِ نفس و شیطان و غیر ماسوی اللہ، صفحہ نمبر: 88 سے 105-باب: در ذکرِ مخالفتِ نفس، کشتن وزیر کردن نفس بعونِ اللہ تعالیٰ (باب چہارم)، صفحہ نمبر:128 سے 169-
- امیر الکونینؒ، ایڈیشن: اوّل، مترجم: سید امیر خان نیازی سروری قادری، اشاعت: اگست 2010ء، باب: راہزنِ باطن نفس و شیطان، صفحہ نمبر:148 سے 167-
- محک الفقر (کلاں)، ایڈیشن: سوم، مترجم: سید امیر خان نیازی سروری قادری، اشاعت: اکتوبر 2011ء، باب اوّل: شرح ”مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ“ صفحہ نمبر: 198 سے 204، باب دوم: شرحِ نفس، صفحہ نمبر: 204 سے 224-
- محبت الاسرار، مترجم: ڈاکٹر کے بی نسیم، باب: نفس امارہ کی مخالفت، صفحہ نمبر: 101 سے 103-

---

[4] (الفجر:27-28)

- جامع الاسرار، مترجم: ڈاکٹر کے بی نسیم، باب سوم: ذکر نفس، روح، شیطان اور دنیا کے بارے میں، صفحہ نمبر: 113 سے 121-
- عین العارفین، مترجم: ڈاکٹر کے بی نسیم، باب اول: ذکر حق سے نفسانی خواہشات دور ہو جاتی ہیں، صفحہ نمبر: 45 سے 52، باب دوم: نفس کو قتل کرنا جہاد ہے، صفحہ نمبر: 53 سے 66 تک- باب سوم: نفس کی اقسام، صفحہ نمبر: 69 سے 78 تک- باب چہارم: فنائے نفس کسے کہتے ہیں؟ صفحہ نمبر: 79 سے 92-

ان ابواب کے اگر فارسی صفحات کو جمع کیا جائے تو یہ تقریباً 178 فارسی صفحات بنتے ہیں- یہ ابواب کے تحت گفتگو ہے اس کے علاوہ بھی ہر باب میں آپ (رحمۃ اللہ علیہ) نے کثرت سے اس موضوع پر گفتگو فرمائی ہے- اسی طرح ابیات باھوؒ (پنجابی) کل 202 ابیات پر مشتمل ہیں- ان 202 پنجابی ابیات میں آپؒ نے 13 ابیات مبارکہ میں نفس کے اوصاف کا ذکر کیا ہے- یہ وہ ابیات ہیں جہاں لفظ نفس آیا ہے اور پھر اس کے اوصاف بیان ہوئے ہیں- جہاں لفظ نفس نہیں آیا اور اس کے معانی مراد ہیں وہ متعدد ہیں- جن ابیات میں نفس کا ذکر ہے، طوالت سے بچنے کی خاطر اس مقالہ میں صرف ابیات کے نمبر پر اکتفا کیا گیا ہے: بیت نمبر: 2، 7، 47، 54، 63، 93، 94، 98، 106، 114، 115، 116، 151

حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) نے نفس امارہ کو قرب الٰہی کے راستے میں سب سے خطرناک دشمن بتایا ہے اور اس کی مثال دیو، کتے، خنزیر، ریچھ، سانپ، بچھو اور بیل و گدھے سے تشبیہ دی ہے- آپؒ نے نفس سے کس قدر خبردار کیا ہے، اس کا اندازہ چند منتخب اقتباسات سے لگایا جاسکتا ہے:

’’نفس دیو کی مثل ہے‘‘-[5]

’’نفس کیا چیز ہے اور اُس کے خصائل کیا ہیں؟ نفس سانپ کی مثل ہے اور اُس کے خصائل کفار جیسے ہیں‘‘-[6]

’’نفس کافر یہود سے خبردار ہو جا کہ وہ تجھے ہر حیلے بہانے مصیبت میں ڈالتا ہے‘‘-[7]

’’نفس چور کی مثل ہے اور طالب اللہ چوکیدار کی مثل جو خطراتِ چور سے خبردار کرتا ہے‘‘-[8]

’’نفس کیا چیز ہے؟ نفس فربہ خنزیر کی مثل ہے جو کفار سے دوستی رکھتا ہے اور خودی و خود پرستی میں مبتلا رہتا ہے‘‘-[9]

’’اگر کوئی سیاہ ناگ تیری آستین میں گھس آئے تو یہ اُس نفس سے کہیں بہتر ہے جو اِس وقت تیرا ہم نشین ہے‘‘-[10]

’’نفس امارہ کو اگر صورت و سیرت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ کافر و بے حیا ہے- صورت میں یہ دیو ہے، سیرت میں یہ خبیث جن ہے‘‘-[11]

’’دونوں جہان میں نفس سے زیادہ بُری اور کمینی چیز اور کوئی نہیں- جو آدمی معرفتِ اِلٰہی حاصل کر لیتا ہے وہ نفس کو پاؤں تلے روند کر اپنی ہستی کو مٹا دیتا ہے اور جو آدمی نفس کو اپنا دوست بنالیتا ہے وہ نفس کا قیدی بن کر ہوا و ہوس کی مستی میں غرق ہو جاتا ہے‘‘-[12]

’’نفس کو سرکش توسن (منہ زور نوجوان گھوڑا) کہتے ہیں، جس پر ہر وقت خود پسندی سوار رہتی ہے- خَلق کی نظر میں تو وہ آدمی ہوتا ہے لیکن خالق کی نظر میں وہ خنزیر و گدھے و کتے و بندر جیسا حیوان ہوتا ہے- صورت میں آدمی لیکن سیرت میں حیوان- ایسے حیوان سے بات کرنا مناسب نہیں- یوں کہیے کہ ایسا صاحبِ نفس ہزار شیطان سے بدتر ہے، اللہ تعالیٰ اِس سے ہمیں اپنی پناہ میں رکھے- پس بارگاہِ حق کی حضوری حاصل کر اور اہلِ نفس آدمی سے دوری اختیار کر‘‘-[13]

---

[5](عین الفقر، ص:91)
[6](عین الفقر، ص:129)
[7](عین الفقر، ص:277)
[8](عین الفقر، ص:155)
[9](عین الفقر، ص:139)
[10](نور الہدیٰ، ص:107)
[11](نور الہدیٰ، ص:239)
[12](محک الفقر کلاں، ص:175)
[13](محک الفقر کلاں، ص:177)

"نفسِ امارہ کو اُس کے اعمال کے مطابق کتے، خنزیر، ریچھ، سانپ، بچھو اور بیل و گدھے سے تشبیہ دی گئی ہے اور اُسے حُبِّ طمع و حرص و بغض و بخل و کذب و غیبت و عجب و کبر سے پہچانا جا سکتا ہے"۔[14]

آپ (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ نفس میں طاعت بھی ہے اور نافرمانی بھی ہے اس پر قابو پالیا جائے تو یہ دوست بن جاتا ہے اور اگر معصیت میں لگ جائے تو سرکش ہو جاتا ہے- جیسا کہ آپؒ فرماتے ہیں:

"نفس کبھی وسیلۂ خدا ہوتا ہے، کبھی فتنہ انگیز و پُر ہوا ہوتا ہے، کبھی عادل بادشاہ ہوتا ہے، کبھی مستیِ اَنَا میں گمراہ ہوتا ہے، کبھی عالم فاضل مفتی قاضی محتسب صاحبِ محاسبہ ہوتا ہے، کبھی رشوت خور و حرام خور ہوتا ہے، کبھی مرشد ہادی صاحبِ ارشاد ہوتا ہے، کبھی خود پرستی و حرص و حسد میں گرفتار ہوتا ہے، کبھی عاشق معشوق ہوتا ہے اور کبھی گداگر و طامعِ مخلوق ہوتا ہے"۔[15]

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

"نفس غصے کی حالت میں درندہ ہوتا ہے، گناہ کرتے وقت بچہ ہوتا ہے، فراوانیٔ نعمت کے وقت فرعون ہوتا ہے، سخاوت کے موقع پر قارون ہوتا ہے، بھوک کی حالت میں دیوانہ کتا ہوتا ہے اور پُر شکم ہو تو مغرور گدھا ہوتا ہے"۔[16]

مزید ارشاد فرماتے ہیں:

"نفس نیک بھی ہے اور بُرا بھی ہے، ہادی بھی ہے اور اہلِ ہوس بھی ہے، عارف بھی ہے اور راہزن بھی ہے، اے باھُو! نفس کی اِن تمام صورتوں کو اپنی نگاہ میں رکھو"۔

"نفس اگر نیک ہو تو دونوں جہان میں اُس سے زیادہ بزرگ و برتر اور کوئی نہیں اور اگر نفس بُرا ہو تو سارے جہان میں اُس سے زیادہ کمینہ و کمتر اور کوئی نہیں"۔[17]

حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) نے اپنی تعلیمات میں جا بجا اس بات کا ذکر فرمایا ہے کہ اعمالِ شریعت خلافِ نفس ضرور ہے جس سے نفس کی مخالفت تو ہوتی ہے لیکن اعمال شریعت کے ساتھ اعمالِ باطن کو اختیار کئے بغیر نفس نہیں مرتا- جیسا کہ آپ (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں:

"جان لے کہ نفسِ امارہ کی قوت و غذا گناہ و معصیت ہے بلکہ یوں کہیے کہ نفسِ امارہ کا تو پیشہ ہی گناہ و معصیت ہے- اگر آدمی رات دن نماز و روزہ جیسی طاعت و بندگی میں مشغول رہے- اور ہمیشہ قائم اللیل و صائم الدہر رہے تو اِس کے باوجود بھی نفسِ امارہ گناہ سے باز نہیں آتا کہ اُس کی تو خصلت ہی گمراہی ہے- آدمی چاہے رات دن مسائلِ فقہ کے مطالعہ میں مشغول رہے یا ریاضتِ تقویٰ و تلاوتِ قرآن اور نص و حدیث کے مطالعہ میں مصروف رہے نفسِ امارہ گناہوں سے باز نہیں آتا کہ اُس کا یارانہ شیطان و دنیا سے ہے- آدمی چاہے خانہ کعبہ کا طواف و حج کرتا رہے یا میدانِ جنگ میں جہاد و قتال کرتا رہے یا ذکر فکر مراقبہ محاسبہ مکاشفہ کشف القلوب و کشف القبور کے مراتب حاصل کر کے غوث و قطب بن جائے نفسِ امارہ گناہوں سے باز نہیں آتا بلکہ ہر وقت گناہوں کی طرف مائل رہتا ہے کہ اُس کی نظر ہمیشہ مردارِ گناہ پر لگی رہتی ہے لیکن جب تصورِ اسم اللہ ذات سے اُس کے دل میں قرب و وصالِ اِلٰہی کی تجلیات کا شعلہ بھڑکتا ہے تو وہ وحدانیتِ نور حضور کے دریا میں غرق ہو کر عارف باللہ فنا فی اللہ کے اِنتہائی مقام پر پہنچ جاتا ہے"۔[18]

"زہد و تقویٰ، صوم و صلوٰۃ اور ریاضتِ حج و زکوٰۃ خلافِ نفس ہے، کیا اِس سے نفس مر جاتا ہے؟ مَیں کہتا ہوں نہیں مرتا- ذکر فکر مجاہدہ مشاہدہ مراقبہ محاسبہ اور وصال حضور مذکور خلافِ نفس ہے، کیا اِس سے نفس مر جاتا ہے؟ مَیں کہتا ہوں نہیں مرتا- وِرد و وظائف، ذکر و تسبیح، تلاوت قرآن اور علمِ مسائلِ فقہ خلافِ نفس ہے، کیا اِس سے نفس مر جاتا ہے؟ مَیں کہتا ہوں نہیں مرتا- موٹا کھردرا لباس پہننا، گُدڑی پہننا، مخلوق سے علیحدگی اختیار کرنا، چُپ رہنا، نیک وصال و خوب خصال ہونا خلافِ نفس ہے، کیا اِس سے نفس مر جاتا ہے؟ مَیں کہتا

[14] (محک الفقر کلاں، ص:255)

[15] (عین الفقر، ص:139)

[16] (عین الفقر، ص:141)

[17] (محک الفقر کلاں، ص:189)

[18] (محک الفقر کلاں، ص:171-173)

ہوں نہیں مرتا- گوشۂ تنہائی میں چلہ کشی کرنا اور ہر چیز سے بے تعلق ہو کر سرگردان پھرنا خلافِ نفس ہے، کیا اِس سے نفس مرجاتا ہے؟مَیں کہتاہوں نہیں مرتا- علم و تعلیم، درس و تدریس اور خدا شناسی خلافِ نفس ہے، کیا اِس سے نفس مرجاتا ہے؟مَیں کہتاہوں نہیں مرتا‘‘-[19]

نفس کس سے مرتا ہے؟

حضرت سلطان باھوؒ نے بڑی تفصیل سے اپنی کتب میں یہ وضاحت بیان کی ہے کہ نفس تصور اسم اللہ ذات اور مرشد کامل کی نگاہ سے ہی مرتا ہے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں:

’’جو آدمی گناہوں سے باز نہیں آتا اور نہ وہ گناہوں سے پشیمان و تائب ہوتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ اُس پر نفس غالب ہے، اُس کا علاج یہ ہے کہ وہ ہر روز اسمِ اعظم کا وِرد کرے اور دل میں تفکرِ ذکر کرے تاکہ لذّت اسمِ اعظم اور غلباتِ ذکر سے نفس معدوم ہو جائے‘‘-[20]

’’نفس آدمی کے وجود میں غائبی چیز ہے اِسے غائبی تلوار ہی سے قتل کر- غائبی تلوار ذکرِ خفیہ ہے، ذاکرِ خفیہ روٹی اِس جہان کی کھاتا ہے اور کام اُس جہان کے کرتا ہے‘‘-[21]

’’قلب جب تصورِ اسمِ اللہ ذات کی مشق سے زندہ ہو جاتا ہے اور ذکرِ ’’اَللّٰہُ‘‘ کی مستی سے جنبش میں آتا ہے تو اسمِ ’’اَللّٰہُ‘‘ کی تاثیر سے نفس بالکل مرجاتا ہے- بھلا یہ کیسے پتہ چلے کہ نفس مرگیا ہے؟ اِس کی نشانی یہ ہے کہ ذاکرِ قلبی کے وجود میں حرص، حسد، کبر، طمع اور ہوا باقی نہیں رہتی اور وہ چوں چرا سے مکمل طور پر پاک ہو جاتا ہے- جو آدمی چوں و چرا سے نجات پالیتا ہے اُس کے دل میں خطرات پیدا نہیں ہوتے- ذاکرِ قلبی جب اِس مرتبے پر پہنچتا ہے تو اُس کا دل ہمیشہ کے لئے پاک ہو جاتا ہے اور اُسے باطن میں انبیاء و اؤلیاء کی ہم نشینی حاصل ہو جاتی ہے‘‘-[22]

’’اِس نفس کو اسمِ اللہ ذات کی تلوار سے قتل کر دے کہ جو اُسے قتل کرتا ہے وہ نجات پا جاتا ہے‘‘-[23]

’’شیخ مرشد واصل سے- شیخ مرشد واصل کسے کہتے ہیں؟ شیخ مرشد واصل دل کو زندہ کرنے والا اور نفس کو مارنے والا ہوتا ہے- بھلا کیسے پتہ چلے کہ یہ شیخ دل کو زندہ کرنے والا ہے؟ جس طرح زبان بظاہر گوشت کا ایک ٹکڑا ہے اُسی طرح دل بھی بظاہر گوشت کا ایک ٹکڑا ہے- جس طرح زبان بلند آواز سے اللہ کا نام لیتی ہے اُسی طرح دل بھی بلند آواز سے اللہ کا نام لیتا ہے جسے بندہ خود بھی سنتا ہے اور ساتھ بیٹھے ہوئے دوسرے لوگ بھی سن سکتے ہیں لیکن شیخ کی پہچان یہ ہے کہ وہ سنتِ رسول (ﷺ) کو زندہ کرتا ہے اور بدعت کو مٹاتا ہے- جو دل حبِّ دنیا میں گرفتار ہو کر لذاتِ ہوائے نفس میں مشغول رہتا ہے اور دنیائے مردار سے باز نہیں آتا اُس کے لئے ضروری ہے کہ اُس پر ذکرِ اَللّٰہُ کی صیقل استعمال کی جائے تاکہ وہ طالبِ مولیٰ بن جائے‘‘-[24]

’’پس مرشد کسے کہتے ہیں؟ جو دل کو زندہ کر دے اور نفس کو مار دے اور جب طالب پر جذب و غضب کی نگاہ کرے تو اُس کے نفس کو زندہ کر دے اور دل کو مار دے‘‘-[25]

حرفِ آخر:

اللہ تعالیٰ کو جوانی کی عبادت اور طاعت بہت پسند ہے- بقول مولانا رومی (رحمۃ اللہ علیہ) جوانی کی توبہ شیوہ پیغمبری ہے- جوانی میں انسان کا نفس بہت سرکش ہوتا ہے اور کسی طرح بھی طاعت کو اختیار کرنے سے گریز کرتا ہے- لیکن اگر جوانی میں کوئی شعیب (مرشد کامل اکمل جامع نورالھدیٰ) میسر آجائے اور ظاہر کے ساتھ ساتھ باطن کی پاکیزگی اللہ کے قلبی ذکر سے نصیب ہو جائے- تو بقول اقبالؒ:

شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

سُلطان العارفین حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) نہ صرف نوجوانوں کو نفس کی سرکشی اور سنگینی سے آگاہ کرتے ہیں بلکہ اسے قابو کر کے دوست کیسے بنایا جا سکتا ہے اس کا پورا فریم ورک بھی دیتے ہیں- آج ضرورت اس امر کی ہے کہ نوجوانوں کو تعلیمات صوفیاء سے روشناس کرایا جائے جس کے باعث وہ نفس کی اصلاح کر کے قربِ الٰہی کو پا سکیں-

☆☆☆

[19](عین الفقر، ص:137)
[20](محک الفقر کلاں، ص:295)
[21](محک الفقر کلاں، ص:265)
[22](محک الفقر کلاں، ص:47)
[23](محک الفقر کلاں، ص:107)
[24](عین الفقر، ص:107)
[25](عین الفقر، ص:125)

اے فقیرِ قادری
اے حضرتِ باھُو سخی رحمۃ اللہ علیہ

شاعر: مستحسن رضا جامی

واقفِ رمزِ جلی، اے حضرت باہو سخی
مرحبا عظمت تری اے حضرتِ باہو سخی

جو بھی ذوق و شوق سے پڑھ لے تیرے افکار کو
کچھ نہیں رہتی کمی، اے حضرتِ باہو سخی

ہم پہ بھی ہو منکشف یہ رمز ھُو کیا چیز ہے
آج محفل ہے سجی، اے حضرت باہو سخی

میری نسلیں عارفوں کے فیض سے لبریز ہوں
ہے مری خواہش یہی، اے حضرت باہو سخی

معرفت کی فقر کی اور علم و عرفاں کی یہاں
اب تلک ہے روشنی، اے حضرت باہو سخی

تیری تُربت! تیرے کُوچے تیرے مئے خانے کی خیر
اے فقیرِ قادری، اے حضرتِ باہو سخی

یہ مرا رنگِ عقیدت، یہ مری ادنیٰ فغاں
اور میری شاعری، اے حضرت باہو سخی

میرے جیسے کتنے دیوانے یہاں موجود ہیں
لے کے آنکھوں میں نمی، اے حضرتِ باہو سخی

اسم اللہ نقش ہو، لوحِ جبیں پُرنور ہو
دے روح کو اک تازگی، اے حضرتِ باھُو سخی

جامیؔ تیری بارگاہِ خاص میں موجود ہے
ہو مکمل حاضری، اے حضرت باہو سخی

☆☆☆

ABYAT-E-BAHOO

ابیاتِ باھو

گودڑیاں وچ جال جنہاندی اوہ راتیں جاگن ادھیاں ھو
سک ماہی دی ٹکن نہ دیندی لوک انھے دیندے بدیاں ھو
اندر میرا حق تپایا اساں کھلیاں راتیں کڈھیاں ھو
تن تھیں ماس جدا ہویا باھو سوکھ جھلارے ہڈیاں ھو

Those who dwell in rags, they observe midnight vigil Hoo
Passion of beloved wouldn't give respite blind people rebut Hoo
My inner is heated by Haqq and we remain standing in night vigil Hoo
Ones flesh leaves the body Bahoo when skinny bones are staggering Hoo

'Gud'Riya'N wich jal jinha'N di oah ratai'N jagan adhiya'N Hoo
Sik mahi di 'Tikkan nah daindi lok anhay dainday badiya'N Hoo
Andar mera 'Haq tapaya asa'N khalya ratai'N ka'Dhiya'N Hoo
Tan thi'N mas juda hoya Bahoo sokh jhalaray ha'Diya'N Hoo

Translated by; M. A. Khan

تشریح:

1: جو لوگ گودڑی پوش (صوفی اور فقیر) ہوتے ہیں یعنی جن کا گذر اوقات اور انحصارِ زندگی اپنے محبوبِ حقیقی کی یاد پر ہوتا ہے وہ آدھی آدھی رات جاگ کر یعنی سحر گاہی اُس کی یاد میں گزارتے ہیں- اُن کا یہی وصف قرآن یوں بیان کرتا ہے:

"اور اُن کے پہلو جدا ہوتے ہیں خواب گاہوں سے اور وہ اپنے ربّ کو پکارتے ہیں ڈرتے ہوئے اور اُمید کرتے ہوئے"-(السجدہ:16)

وہ دراصل اللہ کے حبیب مکرم (ﷺ) کی اس سُنت کو ادا کر رہے ہوتے ہیں جس کے بارے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"اے چادر میں لپٹنے والے! رات کو قیام کیا کرو مگر کبھی کبھی آدھی رات یا اِس سے کچھ کم یا زیادہ کر لیا کرو"-(المزمل:1-3)

2: عاشقانِ الٰہی تو اللہ عزوجل کے عشق و محبت میں ہر چیز سے بے نیاز ہو کر اس کی طلب میں سرگرداں چلتے رہتے ہیں اور رات دن ایک ہی فکر میں رہتے ہیں کہ ہمارا مالک و خالق ہم سے راضی ہو جائے لیکن اس راز کو بیگانے نہیں جانتے جس کی وجہ سے وہ انہیں طعن و تشنیع کا نشانہ بناتے ہیں کیونکہ وہ انہیں دیوانے لگتے ہیں اور حقیقت میں وہ ہیں ہی دیوانے- جیسا کہ حضور نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا:

"اللہ عزوجل کا ذکر اتنی کثرت سے کرو کہ لوگ تمہیں دیوانہ کہیں"-(مسند احمد)

حضرت سُلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) ارشاد فرماتے ہیں:

"واصلانِ حق تو سوتے جاگتے ہر حال میں خوش رہتے ہیں، یہ بے خبر لوگ بھلا اِن مستوں کے حالات کو کیا جانیں؟"(عین الفقر)

3: اسم اللہ ذات کے مشاہدے سے تجلیاتِ نور کا ایسا سلسلہ شروع ہوتا ہے کہ جس سے طالب اللہ کا قلب و قالب سر سے لے کر قدم تک نور ہی نور بن جاتا ہے اور اسم اللہ ذات کی تپش اُسے دن رات جلائے رکھتی ہے جس طرح کہ آگ خشک لکڑیوں کو جلاتی ہے اور یہ آگ سرد نہیں ہوتی سوائے اس محبوبِ حقیقی کے درشن کے، اس کے شوق وصال کی شدت میں ساری ساری رات قیام میں گزار دیتے ہیں-

4: اُس کے ہجر و فراق اور اُس کے حصول کی مشقت نے انتہائی لاغر اور نحیف کر دیا ہے، حضرت سلطان باھو (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں:

"جب ذکرِ خفیہ کیا جاتا ہے تو ذاکر کے وجود کا سارا گوشت ریزہ ریزہ ہو کر جدا ہو جاتا ہے- اِس طرح کے ذکرِ جہر اور ذکرِ خفیہ سے آنکھوں سے خون جاری ہو جاتا ہے- مصنف کہتا ہے کہ اِس فقیر کی والدہ محترمہ اِسی طرح کا ذکرِ خفیہ کیا کرتی تھیں اور اُن کی آنکھوں سے خون جاری رہا کرتا تھا- ایسے ذاکر کو حضور الحق فقیر کہتے ہیں- جس ذاکر کا ذکرِ جہر و ذکرِ خفیہ اِس معیار کا نہیں اُسے ذاکر و ذکرِ حقیقی نہیں کہا جا سکتا-(محک الفقر کلاں)

آپ (رحمۃ اللہ علیہ) ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں:

"مجھ پر ایک پردہ پڑا ہوا تھا جسے چنگاری کے شعلہ نے جلا کر راکھ کر دیا- اب مَیں بہت خوش ہوں کہ اُس پردے کی راکھ کے پاس بیٹھا ہوں"-(محک الفقر کلاں)

www.sultanbahoo.net
Hazrat Sakhi Sultan Bahoo
حضرت سخی سلطان باھو
عالمی معیار کی علمی و تحقیقی منفرد ویب سائٹ
www.sultanbahoo.net
Who is Hazrat Sakhi Sultan Bahoo
About him
Teachings
Writings
Impact
O desirous Come, O desirous Come, O desirous Come; By God, I can take you to Allah the first day you come
حضرت سخی سلطان باھو کون تھے؟
شخصیت
تعلیمات
تصانیف
تاثیر
Biography
READ MORE
Writings & Teachings
READ MORE
Flames emerging from smoke of longing pain no one dare acquire warmth from it Hoo. The heat of such...
READ MORE
SULTAN BAHOO
Spiritual Masters
570
601
642
1166
1630
VIEW TIME LINE
Ennobling Power of Sultan Bahoo's Poetry
READ MORE
Sultan Bahoo Life
Sultan Bahoo Books
Sultan Bahoo Blog
HOME
LIFE
TEACHINGS
ABYAT
BOOKS
BLOG
CONTACT
PARENTS
FAMILY
ANCESTORS
SPIRITUAL MASTERS
SPIRITUAL KHALIFS
WRITINGS & PUBLICATIONS
SARWARI-QADRI (SUFI ORDER)
MAUSOLEUM
تحقیق، جامع، منفرد اور جدید ویب سائٹ
والدین
خاندان
آباؤاجداد
سلطان الفقر
روحانی خلفا
تصانیف لطیف
سروری قادری (صوفی سلسلہ)
مزار پرانوار

مولانا رومی اور حضرت سلطان باھُو

کے افکار پہ مرتب کردہ کتاب،

علم و عرفان کا ایک حسین امتزاج

New Arrival

علم دوست لوگوں کے لئے

خوبصورت تحفہ

دنیائے اسلام کی دو عظیم شخصیات کی

تعلیمات کا ایک

تحقیقی جائزہ

Mevlana Jalal ud Din

Rumi

&

Sultan ul Arifeen Sultan

Bahoo

Collection of Selected Essays

Compiled By:

Sahibzada Sultan Ahmed Ali

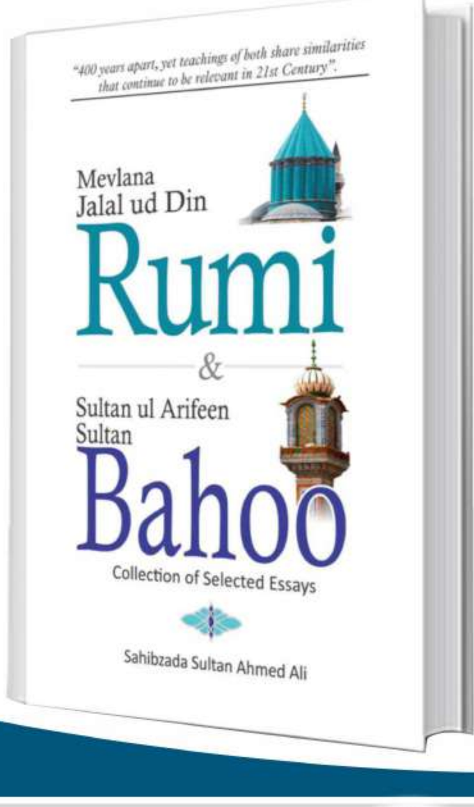

MUSLIM Institute
ISLAMABAD - LONDON
Web: www.muslim-institute.org,

پی او بکس نمبر 11 جی پی او لاہور
ویب سائٹ: www.alfaqr.net
ای میل: alarifeenpublication@hotmail.com

العارفین پبلیکیشنز (رجسٹرڈ) لاہور-پاکستان
اپنے قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

AL-ARIFEEN PUBLICATIONS